ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو

مقالہ نگار:

الطاف حسین

رجسٹریشن:123-FLL/MSURDU/F14

نگران:

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

2018

Accession no. IH 21436
MS
891.43909
ال ڈ

اردو ادب - تاریخ و تنقید

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار:

الطاف حسین

رجسٹریشن نمبر:123-FLL/MSURDU/F14

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان و ادب

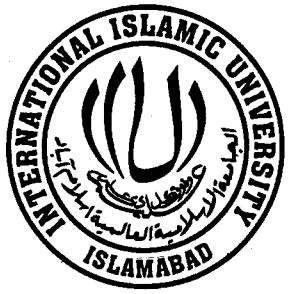

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں MS اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **"ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ"**

مقالہ نگار: الطاف حسین

رجسٹریشن نمبر: 123-FLL/MSURDU/F14

کمیٹی دفاع مقالہ

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
چیئرمین
شعبۂ اُردو

پروفیسر ڈاکٹر منور اقبال احمد
ڈین
کلیہ زبان وادب

ڈاکٹر شیراز فضل داد
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر فاخرہ نورین
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
فاطمہ جناح یونیورسٹی، راولپنڈی
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

ستمبر، 2018ء

فہرست ابواب

نام ابواب	صفحہ نمبر
پیش لفظ	i
باب اول: ادبی تاریخ نویسی، اصول وتصورات	۱
باب دوم: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: مصنف وتصنیف	۵۲
باب سوم: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ''تحقیقی جائزہ	۹۴
باب چہارم: ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'': تنقیدی جائزہ	۱۳۱
ماحصل	۱۷۲
کتابیات	۱۷۵

تصدیق نامہ

الطاف حسین نے رجسٹریشن:123-FLL/MSURDU/F14 کے تحت اپنا تحقیقی وتنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو، بعنوان ''**ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ**'' میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ Turn It In رپورٹ کے مطابق مقالہ سرقہ سے پاک ہے۔اس مقالے پر ایم۔ایس کی ڈگری جاری کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

اقرار نامہ

میں، الطاف حسین، رجسٹریشن نمبر 123-FLL/MSURDU/F14 حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج) کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

(الطاف حسین)

مقالہ نگار

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

پیش لفظ

بصد سامانِ رسوائی

اردو ادب کی تاریخ کا موضوع ادب کے طالب علم کے لیے جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی، میں نے اس موضوع کو منتخب کرنے کا فیصلہ اسی مشکل کو آسان بنانے کی خاطر کیا، ابتدا میں مقالہ لکھتے ہوئے کئی بار ایسا لگا کہ میں نے اس مشکل کو گلے لگا کر کچھ اچھا نہیں کیا لیکن پھر ہمت باندھ کر کام کو مکمل کرنے کی کوشش کی، جوں جوں مقالہ آگے بڑھتا گیا اردو ادب کی تاریخ کے مطالعے نے ایک شوق کی صورت اختیار کر لی، میں ایک سپاہی ہوں اور سپاہی کے شب و روز کی ورزشوں میں سے اردو ادب کی تاریخ کا مقالہ کشید کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، مشکلوں پر ایک مشکل یہ پڑی کہ عین اسی وقت جب مقالے کا آغاز ہونے والا تھا میرا تبادلہ کراچی ہو گیا اور یوں میں اپنے شفیق اساتذہ اور ہمدرد دوستوں کی قربت سے محروم ہو گیا اور غالب کا مصرع شکل بدل کر کچھ یوں دماغ میں گردش کرنے لگا۔

؎ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ مشکل ہو گئی

کچھ عرصہ نئے شہر سے مانوس ہونے میں بیت گیا اور کراچی میں جب میں نے مقالے کی طرف پھر سے رجوع کیا تو اساتذہ اور دوستوں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی، ملازمت اور گھریلو مصروفیات کے بعد آرام کے لیے بچنے والے تھوڑے سے وقت کو مقالے کی نذر کر دینا کس قدر سود مند ثابت ہو گا اس کے بارے میں فی الحال میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ مقالے کی تسوید کے بعد آج یہ سطریں لکھتے ہوئے مجھے دلی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔

جدید دور کی ترقی اور انٹرنیٹ کی سہولیات نے زندگی کے بہت سے دیگر امور کی طرح کتب کے مطالعے میں بھی بہت سی آسانیاں پیدا کر دی ہیں، تحقیق کے دوران یہ جان کر حیرت اور مسرت ہوئی کہ انٹرنیٹ میں کئی ایسی سائیٹس ہیں جن میں اردو کے قدیم و جدید ادب کی اہم اور نادر کتب پی ڈی ایف کی صورت میں موجود ہیں جن کو قاری آن لائن یا ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ سکتا ہے، اس حوالے سے کوئی اور گوگل انجن کی اہمیت و افادیت کا اعتراف کرے نہ کرے میں یہ بات کہتے ہوئے قطعاً عار محسوس نہیں کروں گا کہ میں نے اپنے مقالے کی تکمیل کے لیے بہت سی کتابیں اور معلومات گوگل کی مختلف سائیٹس سے حاصل کی ہیں، جن کا پتہ کتابیات کی فہرست

میں درج ہے، اس ضمن میں پاکستان اور بھارت کے ویب ڈویلپرز کی خدمات قابل ستائش ہیں جن کی انتھک محنت اور کوششوں سے اردو زبان میں علمی و ادبی کتب کا وسیع اور بیش قیمت ذخیرہ انٹرنیٹ کی دنیا کا حصہ بن گیا ہے، جس سے طلباء اور علم و ادب کے شائقین بھرپور استفادہ کر رہے ہیں، اردو ادب کی کتب کے حوالے سے اس شعبے میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

عموماً مقالہ نگار یا محقق تحقیق کا موضوع بنے والے مصنف سے رجوع کرتے ہیں اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مقالے کے حوالے سے تمام تر مواد مصنف مقالہ نگار کو ہدیہ کر دیتا ہے میں نے اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے مصنف ڈاکٹر سلیم اختر سے رجوع نہیں کیا، اس روایت سے بغاوت مجھے خاصی مہنگی پڑی، اور اگر ایسا کرتا تو میرا کام بھی بہت آسان ہوسکتا تھا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا، میرا خیال تھا کہ مصنف کا احسان مند ہونے کے بعد میں شاید خالص تحقیق و تنقید کا حق ادا نہ کر پاؤں گا، خیر حق تو پھر بھی مجھ سے ادا نہیں ہوسکا، بقول مرزا غالبؔ۔

؎ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ڈاکٹر سلیم اختر کی ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کئی حوالوں سے متنازع سہی لیکن جو سکہ رائج الوقت ہے اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کتاب کی قبولیت سے اردو ادب کے تمام اساتذہ، شایقین اور طالب علم بخوبی واقف ہیں، ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے اس کتاب کا معیار چند ایک سطحی خامیوں کے باوجود بہت بلند ہے، اور اسی لیے میں نے اس کتاب کو اپنے موضوع کے طور پر چنا، ہم اس کتاب کو اردو ادب کی ایک مختصر مگر جامع ادبی تاریخ کہہ سکتے ہیں، اس کتاب کے مقام و مرتبہ کا اندازہ مصنف کی ۴۵/۵۰ سالہ مسلسل محنت اور اس کی مقبولیت سے لگایا جا سکتا ہے، میں نے اس مقالے میں کوشش کی ہے کہ نہ تو مصنف کی اس تصنیف کی بے جا تعریف کی جائے اور نہ ہی تنقید، تمام محاسن و معائب کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اس کتاب کے ادبی مقام مرتبے پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن چوں کہ تحقیق و تنقید کے میدان میں ابھی میں طفل مکتب ہوں اس لیے میرے اس کام میں کمی کوتاہی اور گنجائش باقی رہ گئی ہوگی اور میں اس کا معترف ہوں۔

اپنے مقالے میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ حتیٰ الامکان بے جا بیانات اور تفصیلات کے اندراج سے

گریز کروں، میں نے اس مقالے میں اردو ادب کی تاریخ کا مختصر جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کی بھی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں مجھے خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، کیوں کہ اول تو ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط پر بہت کم کام ہوا ہے اس لیے اس موضوع پر مواد حاصل کرنا خاصا مشکل کام ہے اور دوسرا یہ کہ جو تھوڑا بہت کام ہوا ہے اس میں ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے محققین ادب کے بیانات کافی گنجلک اور ایک دوسرے سے متصادم ہیں، اس لیے اس سلسلے میں نے ادبی مورخین کی تواریخ سے ادبی تاریخ نویسی کے بارے میں پیش کردہ ان کے نظریات ورجحانات پر زیادہ انحصار کیا اور ان سے ہی ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کے حوالے سے نکات کشید کرنے کی کوشش کی، میں نے اپنی اس ساری کوشش میں کتنی کامیابی حاصل کی اس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔

اس مقالے کی تکمیل کے دوران مجھے سب سے زیادہ حیرت علی جواد زیدی صاحب کی کتاب ''تاریخ ادب کی تدوین'' کے مطالعے کے دوران ہوئی جنھوں نے ایک ہی جملے میں اردو کی تمام ادبی تواریخ کا قصہ پاک کرنے کی کوشش کی، ان کی اس جرأتِ رندانہ کا ردِعمل میرے ذہن میں کچھ یوں ابھرا کہ مجھے اردو ادب کے تمام تذکرے بھی اردو ادب کی تاریخ نویسی کی روایت کی زنجیر کی صورت میں نظر آئے میں ذاتی طور پر اب یہ سمجھتا ہوں کہ تذکرے ہی اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی ابتدائی صورت ہیں۔

میں اپنے نگران اور شفیق استاد ڈاکٹر ارشد معراج صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ ان کی محبت اور شفقت ہمیشہ میرے ساتھ رہی، مقالے کی تکمیل تک تمام تحقیقی امور پر انہوں نے اپنی خصوصی نظر رکھی، میری ملازمت کے مشکل اوقاتِ کار کو مدنظر رکھتے ہوئے ارشد صاحب نے مواد کی فراہمی اور مقالے کی تصحیح وتکمیل میں میری بھرپور رہنمائی ومدد کی، میں اپنی جامعہ کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر روش ندیم، ڈاکٹر کامران کاظمی، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر طیب منیر (مرحوم)، ڈاکٹر نجیب جمال، ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی محبتوں اور شفقتوں کا شاکر ہوں، اس کے علاوہ میں تصوّر حسین، عادل بادشاہ، اعجاز بھٹی، آغا خاور عباس نقوی، علی مہدی، عتیق، ساجد، اور دیگر دوستوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ جن کی محبت ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔

الطاف سروش

باب اول

ادبی تاریخ نویسی، اصول وتصورات

ا۔ تاریخ اور تاریخ نویسی، تصور وارتقاء

ب۔ اردو کی ادبی تاریخ نویسی، آغاز وارتقاء

ج۔ ادبی تاریخ نویسی، اُصول وضوابط

د۔ مختلف ادبی تاریخ نویسوں کے تصورات

پہلا باب

ادبی تاریخ نویسی، اصول وتصورات

ا۔تاریخ اور تاریخ نویسی: تصور وارتقاء

لغت کی کتابوں میں تاریخ کے معنی ،وقت کا تعین کرنا ، وقت کی نشاندہی کرنا، یا وقت بتانے کے ہیں تاریخ کا مادہ ''ورخ'' ہے اور یہ عربی زبان کا لفظ ہے ابتدا میں یہ لفظ قمری مہینوں کے لیے استعمال ہوتا تھا نویں صدی میں یہ لفظ حالاتِ گزشتہ کی مستند تحریروں کے لیے استعمال ہونے لگا۔انگریزی میں "history" کا لفظ یونانی زبان کے لفظ "historia" سے آیا جس کے معنی تحقیق، تفتیش اور مطالعہ ہیں اصطلاحاً تاریخ سے مراد وہ علم ہے جس میں ماضی میں پیش آنے والے ایسے اہم واقعات و حادثات کی سنہ وار ترتیب و تدوین کی جاتی ہو جن سے دنیا میں کوئی بڑی تبدیلی یا انقلاب رونما ہوا ہو یا جن کی سیاسی، سماجی ، معاشی، معاشرتی و سائنسی سطح پر اہمیت ہو، یعنی علم تاریخ میں ماضی میں بکھری ہوئی انسانی سرگرمیوں کو سنہ وار ترتیب دیا جاتا ہے انسانی تاریخ کے ابتدائی نقوش منظوم اساطیر، الواح اور روایات کی صورت میں ہمیں ملتے ہیں انسان نے جب لکھنا سیکھا تو سینہ در سینہ منتقل ہونے والے حادثات و واقعات کو پتھروں کی سلوں، درختوں کی چھال اور چمڑے کے ٹکڑوں پر محفوظ کرنے لگا، احرامِ مصر کی دیواروں پر کندہ تحریریں اور ہومر کی نظمیں انسان کی ابتدائی تاریخ کے اہم نمونے ہیں۔

کاغذ کی ایجاد کے بعد دیگر علوم کی طرح انسانی تاریخ کا دائرۂ کار بھی وسیع تر ہونے لگا ابتداً تواریخ بادشاہوں اور طاقتور حکمرانوں کے زیرِ اثر لکھی جاتی رہیں اسی لیے قدیم تواریخ کا زیادہ تر حصہ بادشاہوں اور سورماؤں کے احوال، ان کی فتوحات، ہزیمتوں، شان وشوکت، مافوقیت، اور ان کے خلاف ہونے والی سازشوں کے کوائف پر مشتمل ہیں جب دنیا سے بادشاہی نظام کا خاتمہ ہونے لگا تو مختلف ممالک کے صدور، وزیراعظموں اور آمروں کے تذکروں پر مبنی تواریخ کا سلسلہ شروع ہوا تاریخ کے اس محدود تصور کی وجہ سے انسانی تہذیب و تمدن ، مذہب ، فنون لطیفہ، ذرائع پیداوار، اور معاشرے کی تشکیل کرنے والے سیاسی، سماجی، تمدنی اور متنوع نوعیت کے دیگر اثرات کے عمل اور دعمل سے جنم لینے والی عصری تصویر کی دید کے بغیر یک طرفہ اور مداحی عناصر تاریخی ارتقاء کے عمل میں غالب ونمایاں رہے۔

تاریخ نویسوں نے حکمرانوں کے خوف سے یا پھر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بے دریغ مبالغہ آرائی سے کام لیا اور اپنے ذاتی عقائد ونظریات کو تاریخ کا حصہ بنانے کی کوشش کی جس کی وجہ سے انسانی تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ جھوٹ کے ملبے تلے دب کر رہ گیا، ڈاکٹر مبارک علی اس حوالے سے اپنی کتاب ''المیہ تاریخ'' میں لکھتے ہیں:۔

> ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ تاریخ کو حکمران طبقوں کے مفادت کے لیے اس طرح استعمال کیا گیا کہ بہت جلد یہ عوام کے لیے غیر دلچسپ بن کر رہ گئی کیونکہ اس کے دائرہ کو صرف بااقتدار طبقوں تک محدود رکھا گیا اور اس میں عوام کی سرگرمیوں اور ان کے کردار کو شامل نہیں کیا گیا تاریخ میں ان شخصیتوں کو ابھارا گیا جنھوں نے اپنے اور محدود طبقے کے مفادات کے لیے کام کیا تھا چونکہ ان افراد کو اس بات کی بڑی خواہش تھی کہ تاریخ میں ان کے لیے بہتر مقام پیدا کیا جائے اس لیے انھوں نے جان بوجھ کر تاریخ کو مسخ کیا اور اپنی شخصیت کو اجاگر کیا اس سلسلے میں ہمارے پیشہ ور مورخوں نے ان کی مدد کی اور ان کی خوشامد میں انھوں نے عوام کو جو تاریخ اور اس کے عمل کے صحیح روح رواں تھے نظر انداز کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نچلے طبقوں میں نہ تو تاریخی شعور پیدا ہوا اور نہ ہی انھیں اس تاریخ سے کوئی دلچسپی رہی کیونکہ ایسی تاریخ جس میں ان کا کوئی ذکر نہ ہو اور ان کے کارناموں کو فراموش کر دے ایسی تاریخ میں ان کے لیے کوئی دلچسپی اور کشش باقی نہ رہی۔(۱)

تاریخ تحقیق بننے سے پہلے محض داستان تھی، گزرے ہوئے زمانوں کی اس داستان میں کچھ کچھ کردار حقیقی ہوتے تھے لیکن ان میں بھی اس قدر افسانوی رنگ ملایا جاتا کہ ان کا حقیقی چہرہ بلکل مسخ ہو کر رہ جاتا، دیوی دیوتاوں اور ان دیکھی مافوق الفطرت طاقتوں کی حیثیت ان داستانوں میں مرکزی ہوتی، انسان کا ذکر ہوتا بھی تو ثانوی حیثیت میں، اسے یا تو دیوی دیوتاوں کا معتوب بنا کر پیش کیا جاتا یا پھر اس کا ذکر اس طرح کیا جاتا جیسے کہ وہ انسان نہ ہو۔

یونان میں تاریخ نویسی: علمِ تاریخ "historia" کی ابتداء یونان سے ہوئی، ہومر کی منظوم داستانوں

''ایلیڈ'' اور ''اوڈیسی'' کو تاریخ کے ابتدائی نمونوں کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ان کو باقاعدہ تاریخی کتب کا درجہ نہیں دیا جاتا کیوں کہ ان میں داستانوی رنگ تاریخی واقعات پر غالب نظر آتا ہے، شروع شروع میں یونانی مورخین تفصیلات کی تنقید اور معجزوں کی تشریحات تک محدود رہے لیکن جب دیومالائی روایت کا مطالعہ زیادہ تنقیدی انداز میں کیا جانے لگا تو یونانی تاریخ نے بھی ایک نیا رخ اختیار کیا یونانی مورخوں کی دلچسپیاں تاریخ کی جدت اور غیر یونانی ریاستوں کی طرف بڑھنے لگیں اس طرح یونانی مورخین دیومالائی عصر سے نکل کر تاریخی عصر میں داخل ہونے لگے، ایران کو فتح کرنے کے بعد یونانی مفکرین نے مشرق کی تاریخ کو اپنے تحقیقی و فکری دائرے میں لیا غیر یونانی ممالک کے تہذیب و تمدن سے شناسائی کے بعد صحیح معنوں میں انہیں خودشناسی کا احساس ہوا اور وہ اپنی روایات کے سلسلے میں زیادہ تنقیدی رویہ اپنانے لگے یونانی منظوم تاریخ ترک کر چکے تھے اور ان کی تاریخ روایتی عقیدت مندی کے ساتھ نثر کے قالب میں آ چکی تھی اس طرز تاریخ کا بانی ''ہیکٹس آف ملیٹس'' تھا۔

ہیکٹس آف ملیٹس نے یونان کے دیومالائی قصص کی سچائی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے ان قصوں میں موجود تاریخی وقوعات اور نظریات کو لغو اور مہمل قرار دیا اور تاریخ لکھنے والوں کو سچائی اور حقانیت کا درس دیا، اگر چہ وہ یونان کی سرحدوں کو عبور نہ کر سکا لیکن اس نے یونانی معاشرے کے روایتی اور مذہبی اقدار کی حد بندیوں پر کاری ضرب لگائی، اس کا کہنا تھا کہ میں وہی لکھتا ہوں جو سچ ہے۔

ہیکٹس کے بعد ہیروڈوٹس نے علم تاریخ کو سنبھالا دیا اس نے کمال جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہیکٹس کے روایتی طرز سے انحراف کیا ہیروڈوٹس نے یونانیوں کی فتح ایران کی جنگ کا تاریخی خاکہ مرتب کیا اور یونانی حدود کو پار کرتے ہوئے ہندوستان، ایران، عرب، شام اور مصر تک کے سماجی معاشی و معاشرتی پہلوؤں کا تاریخی حال مرتب کیا ہیروڈوٹس نے واقعات کو قاری کے لیے دلچسپ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی یہ تالیف ادبی تاریخ اور تاریخ کے تعلق کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔

سوفسطائی زمانے کا مورخ تھیوسیڈیز ہیروڈوٹس کی تاریخ گوئی کو یکسر رد کرتا ہے اور اسے محض ایک داستان گو قرار دیتا ہے تھیوسیڈیز نے پانچویں صدی قبل مسیح میں تاریخ کا ایک نیا نقطہ نظر پیش کیا اس نے سوفسطائی مفکرین سے تحقیقی و تنقیدی رجحانات جذب کیے اور روایتی اسلوب تحریر کی تقلید سے گریز کیا، اس نے ہیروڈوٹس

کی طرح فتح ایران کا جشن نہیں منایا بلکہ تنقیدی اصولوں کی روشنی میں ایک فاتح ریاست کے تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی، جدوجہد کے آغاز ہی سے اس نے واقعات کو قلمبند کرنا شروع کر دیا یوں صحیح معنوں میں تھیوسیڈیز نے عصری تاریخ نگاری کے اصول وضع کیے اس نے ایک ایسی تاریخ کا خاکہ کھینچا جو جنگوں اور ریاستوں کے تعلقات پر مبنی تھی اس طرح وہ سیاسی تاریخ کا بھی موجد بن گیا اس نے علم تاریخ میں صداقت اور مطابقت کے اصول وضع کیے اور علم تاریخ پر یونانی تنقیدی فلسفے کا اطلاق کیا۔ تھیوسیڈیز نے ان تاریخ نویسوں کو شاعروں کا درجہ دیا جو سچائی بیان کرنے کے بجائے قاری کا دل بہلانے میں مصروف رہے اس نے صداقت اور مطابقت کے اصولوں کو پیش نظر رکھا اور اپنے موضوعات کو سادہ اور سپاٹ انداز میں بیان کیا تاکہ واقعات اپنی صداقت کے ساتھ قاری تک پہنچیں۔

پولیبٹس کا دور حیات وہ زمانہ تھا جب یونان اور روما ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے روم کی فتح تک پولیبٹس نے عملی سیاست اور میدان جنگ میں فوجی دستون کی قیادت کی ۱۶۸ ق م میں جنگ کے اختتام پر وہ بطور یرغمال روم پہنچا اور ایک رومی جرنیل کے مکان میں نظر بند رہا سولہ سالہ قید کے دوران اس نے روم کی فتح کی وجوہات، رسوم و روایات اور معاشرے کا بغور مطالعہ کیا اور وہی پر اپنی کتاب دی ہسٹریز کے کئی باب قلمبند کیے اس غیر معمولی تصنیف میں پولیبٹس نے سو سال سے زائد عرصہ کے حالات قلمبند کیے، تھیوسیڈیز کی طرح پولیبٹس بھی اس بات کا قائل ہے کہ واقعات کو جوں کا توں بیان کرنا مورخ کا فرض ہے۔ تاریخ نویسی کے سلسلے میں اس نے تین اصول وضع کیے۔

۱۔ مآخذ کا مطالعہ

۲۔ تنقید

۳۔ ذاتی علم اور تجربہ

یونان میں تاریخ نے جو روپ دھارا تھا اس میں مافوقیت یا آسمانی قوتوں کے تحت واقعات پیدا نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ واقعات خاص قوانین کا نتیجہ تھے اور ان کے پیچھے وجوہات بھی تھیں اس لیے ان واقعات کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہوتی تھی کیونکہ جب کوئی چیز اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ موجود ہو تو ذہن اس کی وجوہات کو جاننے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے سائنسی سوچ پیدا ہوتی ہے۔

یورپ میں تاریخ نویسی کا تصور: یورپ میں عہد وسطیٰ میں جب تک چرچ کا غلبہ رہا تاریخ مذہب کے زیر اثر رہی مگر تحریک نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاح مذہب کے بعد تاریخ کے مفہوم میں تبدیلی آئی خصوصیت سے رومانوی تحریک نے تاریخی فکر میں انقلابی تبدیلیاں کیں اس تحریک کی فکری بنیاد انفرادی آزادی پر تھی اور آزادی کی اہمیت ان کے ہاں انتہائی اہم تھی، مغرب میں جدید تاریخی نظریات کا پرچار کرنے والے مفکرین نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے علم تاریخ کی تفصیلات پر روشنی ڈالی اور اس کو وسیع تر کرتے چلے گئے، جنگوں کے احوال، سلطنتوں کے معاملات، بادشاہوں اور جرنیلوں کی کہانیوں کے علاوہ ان تاریخ دانوں نے معاشرہ، سماج، ادب، کلچر، نفسیات، مذہب، حکمران، رعایا، غرض ہر محرک حیات کو تاریخ کا حصہ بنایا، رومانوی تحریک کے علمبرداروں کا رویہ ماضی کی طرف ہمدردانہ تھا اور وہ قدیم عہد کو وحشت اور بربریت کا دور ماننے سے انکاری تھے۔

برلن یونیورسٹی میں لیو پولڈ رانکے تاریخ کا پروفیسر تھا اس نے فن تاریخ نویسی کے خطوط میں انقلابی تبدیلیاں کرتے ہوئے اسے ایک نیا سائنسی مزاج عطا کیا، رانکے کو جدید فن تاریخ نویسی کا بانی تصور کیا جاتا ہے اس نے کانٹ، نٹشے، گوئٹے، بمبہور اور دیگر عظیم مفکروں اور تاریخ دانوں کا بغور مطالعہ کیا، رانکے نے تاریخی تحقیقات کا آغاز کرتے ہوے قدیم روم سے وسطیٰ کے جرمنی کی تاریخ میں ہونے والی تبدیلیوں تک پہنچنے کی کوشش کی، اس نے جب اپنی پہلی کتاب لاطینی اور ٹیوٹونگ قوموں کی تاریخ ۱۸۲۴ء لکھی تو دنیا نے اسے ایک ابھرتا ہوا آدمی کہہ کر پکارا۔ اس نے ان تسلیم شدہ وحدتوں کو ماننے سے انکار کر دیا جو اس وقت روایتی طور پر مسلمہ سمجھی جاتی تھیں، اس کے علاوہ اس نے سرزمین یورپ میں قائم ہونے والے اداروں ریاست، کلیسا، سلطنت اور پاپائیت کی قدیم اور سیم زدہ بنیادوں پر زبردست حملے کیے، تاریخی ذرائع کی تنقید پر رانکے نے ایک الگ ضمیمہ مرتب کیا جس نے جدید تاریخ نویسی کی راہیں روشن کر دیں۔ ۸۳ سال کی عمر میں رانکے نے تاریخ عالم ' کی پہلی جلد ۱۸۸۰ء میں شائع کرادی اور سال بہ سال ایک نئی جلد مرتب کی اور اپنی وفات تک اس کتاب کی سات جلدیں لکھ ڈالیں، اس کے علاوہ اس نے ''فلسفہ تاریخ'' لکھنے کا منصوبہ بنایا لیکن وہ اس منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا، تاریخ کے بارے میں رانکے کی یہ رائے تھی کہ تاریخ میں ہر اس چیز سے گریز کرنا چاہئے جو بنیادی طور پر معتبر حقائق سے دور ہو۔

ٹائن بی ۱۴ اپریل ۱۸۰۹ء میں لندن میں پیدا ہوا، وہ ساری زندگی جدید زبانوں، ادبیات اور تاریخ کی

تدوین وتدریس کے شعبوں سے منسلک رہا، اس کی مشہور کتاب اے سٹڈی آف ہسٹری ہے جس کا ترجمہ ''مطالعہ تاریخ'' کے عنوان سے ہو چکا ہے، یہ کتاب کل ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کی اولین اشاعت ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۱ء کے دوران عمل میں آئی، ٹائن بی نے اس کتاب میں تاریخ کو ملکوں اور نسلی گروہوں کی کہانی بنانے کے بجائے اسے تہذیبوں کے عروج وزوال کی داستان کے طور پر پیش کیا، اس نے سپنگلر کے میکانکی نقطہ نظر کی سختی سے تردید کی۔

کالنگ ووڈ مشہور انگریز فلاسفر اور تاریخ دان ہے وہ ۲۲ فروری ۱۸۸۹ء کو برطانوی شہر ''کارٹ فل'' میں پیدا ہوا، تاریخ نویسی پر لکھی گئی اس کی مشہور کتاب آئیڈیا آف ہسٹری ہے، اس کے خیال میں نیچرل سائنس کی طرح تاریخی عمل کو عقل کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا کیونکہ مورخ ماضی کے واقعات کو براہ راست نہیں دیکھ سکتا اس لیے اس کو اپنے تاریخی تخیل کے زور پر تاریخی واقعات کی تشکیل نو کرنی پڑتی ہے، کولنگ ووڈ نے روشن خیال مفکرین پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ کا دائرہ کار وسیع ہونا چاہئے اور ان پہلوؤں کو سامنے لانا چاہئے جنہیں ان لوگوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

شیلے انگلینڈ کا مشہور شاعر، ناول نگار، ڈرامہ نگار، اور مورخ تھا، اس نے اپنی شریک حیات کے ساتھ مل کر ہسٹری آف اے سیکس ویکس لکھی، جس میں اس نے تاریخ کے بارے میں یہ نظریہ دیا کہ تاریخ انسان کی گزشتہ سرگرمیوں کی کہانی ہے اور لوگوں کی حرکت سے اس میں تبدیلیاں آتی ہیں۔

فرائیڈ آسٹریا کے ایک قصبے فارئیبرگ میں ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوا، وہ ایک منجھا ہوا نیورولوجسٹ، اور ماہر نفسیات تھا فرائیڈ نے سب سے پہلے انسانی نفسیات کی جانچ پڑتال کے عمل کا باقاعدہ آغاز کیا اور انسانی نفسیات، اس کے محرکات اور اس کے تحلیل وتجزیہ پر متعدد کتب اور مقالے تحریر کیے، اس کے تاریخ کے حوالے سے پیش کردہ نظریات بھی اہمیت کے حامل ہیں، فرائیڈ کے خیال میں انسانی تاریخ اور سماج کے ادارے انسانی لاشعور میں موجود تضادات کو دبانے سے وجود میں آتے ہیں۔

والٹیر ایک عظیم مغربی مفکر ہے جس نے اپنی ساری عمر ظلم و جبر اور مظلوموں کے حقوق کی پامالی کے خلاف جدوجہد میں گزار دی وہ ۱۶۹۴ء میں فرانس میں پیدا ہوا، اس نے شاعری، ناول نگاری، اور علم تاریخ میں اپنا لوہا منوایا، تاریخ کے بارے میں والٹیر کے قائم کردہ نظریات کو آج بھی کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی

مشہور تاریخی کتب میں ہسٹری آف چارلس اور دی ایج آف لوئس شامل ہیں، والٹیر نے فرضی اور غیر مستند مواد کو مسترد کرنے اور تاریخی حقائق کی سائنسی انداز میں جانچ پڑتال پر زور دیا، والٹیر نے تاریخی عمل کو میکانیکی قرار دیا۔ اور اس کی تشریح یوں کی کہ فطرت نے ہر مخلوق کے لیے قوانین مرتب کیے ہیں مثلاً، پرندہ گھونسلہ بناتا ہے ستارے اپنے متعین راستے پر چلتے ہیں اسی طرح دنیا میں تاریخی عمل بھی میکانیکی طور پر جاری ہے۔

سپنگلر ۲۷ مئی ۱۸۸۰ء میں جرمنی میں پیدا ہوا، اس نے فلسفہ اور تاریخ میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، اس کی مشہور تصنیف دی ڈیکلائن آف دی ویسٹ ہے جو ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر آئی جس میں اس نے مجموعی طور پر پوری دنیا کی تاریخ کا احاطہ کیا، اسپنگلر نے بھی والٹیر کی طرح میکانیکی عمل کی تائید کی اور مغربی تہذیب کو زوال پذیر کہا۔

میکاولی کی پیدائش ۱۴۶۹ء میں اٹلی کے شہر فلورنس میں ہوئی اسے جدید سیاسی فکر کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے، میکاولی نے تاریخ کو ایک سیکولر نقطہ نظر دیا اس نے کہا کہ انسان کے وجود اور اس کی سرگرمیوں کو عملی حقائق کی روشنی میں جانچنا اور پرکھنا چاہیے نہ کہ مذہبی و اخلاقی اقدار کے پیمانے میں، اس نے تاریخ کو مذہب اور اخلاق سے آزاد کر دیا اور سیکولر اور سائنسی علم تاریخ کی بنیاد رکھی۔

اشتراکی نظریے کا بانی کارل مارکس ۵ مئی ۱۸۱۸ء میں جرمنی کے پرشیا میں پیدا ہوا، اس نے سرمایانہ نظام کے جبر، مزدور طبقے پر ہونے والے مظالم، اور طبقاتی نظام کے خلاف فلسفیانہ بغاوت کی، کارل مارکس کے خیال میں انسان کی تاریخ اس داستان کا حصہ ہے جس میں زبوں حال طبقے بہتر معاشی مستقبل کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں، استحصال کرنے والے اور استحصال کا شکار ہونے والے طبقوں کے درمیان ایک مسلسل آویزش رہتی ہے، اس کشمکش کو کارل مارکس نے طبقاتی کشمکش کا نام دیا ہے اس کے خیال میں یہی طبقاتی کشمکش انسان کے سماجی ارتقاء کا باعث بنی، جاگیردارانہ نظام نے اس طبقاتی کشمکش کی بدولت سرمایہ دارانہ نظام کے لیے جگہ خالی کی اور سرمایہ دارانہ نظام اسی طبقاتی کشمکش کی بدولت بالاخر غیر طبقاتی معاشرے کے لیے جگہ خالی کرے گا ''تاریخی مادیت'' اسی مارکسی پہلو کا نام ہے۔

مسلم دنیا میں تاریخ کا تصور: اسلام کے ابتدائی دور میں عرب قبائل اپنے تشخص، حسب و نسب اور

خاندانی شجروں کو محفوظ کرنے کے لیے خاندانی اور قبائلی سطح کی تواریخ لکھتے رہے اس سلسلے میں البلادی کی الانســـــاب اہم تاریخی تصنیف ہے جونسب کے دائرے میں لکھی گئی، مسلم دنیا میں تاریخی جہت میں اس وقت تبدیلی آئی جب اسلام میں ملوکیت نے اپنے قدم جمائے، بنوامیہ اور بنوعباسیہ کے ادوار میں تاریخ اس انداز میں لکھی گئی کہ ہر انفرادی خلیفہ کے دور حکومت کو تاریخ کا دور سمجھا گیا، مسلمانوں کی تاریخ نویسی کا ابتدائی اور اہم موضوع نبی کریم ﷺ کی سوانح حیات تھی سیرت نبوی ﷺ کے موضوعات میں مورخوں نے آدمؑ سے نبی کریم ﷺ کی حیات تک کی تاریخ کو تورات، انجیل، عرب قبیلوں کے نسب ناموں اور قرآن وحدیث سے مرتب کیا۔

ابن اسحاق پہلا شخص تھا جس نے سیرت رسول ﷺ قلمبند کی، دسویں صدی میں فتوحات نے عربوں کے سیاسی افق کو وسعت دی اور عالمی تواریخ لکھنے کا رجحان فروغ پانے لگا یعقوبی، طبری، المسودی نے تخلیق کائنات سے لے کر زمانہ' رواں تک کی تاریخیں لکھیں عالمی وسعت کے اعتبار سے یہ تاریخیں اگرچہ نامکمل تھیں لیکن عالمی تاریخ نویسی میں سنگ میل ثابت ہوئیں۔

ابن مسکویہ نے تاریخ کو سیکولر نقطہ نظر دیا اس نے خرافات سے اجتناب کرتے ہوئے ایسے واقعات قلمبند کیے جن میں انسانیت کا درس تھا

ابو زید عبد الرحمن بن محمد بن محمد بن خلدون ۱۳۳۲ء۔۱۴۰۶ء بلند پایہ فلسفی، سیاستدان اور مورخ تھے، تیونس میں پیدا ہوئے اور مصر میں وفات پائی، ان کا سب سے بڑا کارنامہ مقدمہ فی التاریخ ہے جو مقدمہ ابن خلدون کے نام سے مشہور ہے، اردو میں ان کی اس کتاب کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں لیکن سب سے زیادہ مستند تراجم ابوالخیر کشفی اور مولانا راغب رحمانی کے ہیں۔ابن خلدون ہر چیز میں غور وفکر کا مادہ اور جانچ پڑتال کی جگہ پاتا تھا یونانی وعربی وعلوم اور ذاتی تجربات ومشاہدات سے اس نے علم تاریخ کے نئے دریچے وا کیے اور تاریخ عالم کے مطالعہ ومشاہدہ سے ایسے قوانین تلاش کیے جو ہر دور میں انسانی معاشرے کے لیے لازم ہوتے ہیں، ماضی کے ایسے واقعات جو اسے اپنے مرتب کردہ قوانین کے خلاف معلوم ہوئے انہیں ابن خلدون نے یکسر رد کر دیا اور ایک نئی تاریخی روش کی بنیاد ڈالی، اپنی کتاب مقدمہ تاریخ میں وہ لکھتے ہیں۔

تاریخ ان واقعات کا مجموعہ ہے جن میں ہر طرح کی ہر قسم کی امثال وحکایات بیان ہوتی

ہیں۔۔۔تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی حالت وقتاً فوقتاً کس طرح بدلتی رہی اور کس طرح اقوام میں مختلف سلطنتوں کا آغاز اور کمال ہوا۔کس طرح وہ زمیں پر پھیلیں اور اس کو آباد کیا۔ یہاں تک کہ ان کے اقبال کا وقت آخر ہوا اور زوال نے ان کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔(۲)

ابن خلدون کے نزدیک تاریخ کسی زمانہ یا نسل کے متعلق مخصوص روایات کے بیان کرنے کا نام نہیں ہے اس لیے مورخ کے لیے محض واقعات کا علم کافی نہیں ہے کیونکہ ملکوں ،نسلوں اور زمانوں کے عام حالات علم تاریخ کا موضوع نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسے علم کا موضوع ہیں جو تاریخ کے محلقات میں سے ہے، یہ علم خود ابن خلدون کی اختراع تھا اور اس کے خیال میں یہ علم بالا سے اس پر نازل ہوا،اس کا خیال تھا کہ یہ علم نہ صرف ماضی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے بلکہ اس سے مستقبل کے بارے میں بھی بتایا جا سکتا ہے۔فن تاریخ نویسی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ابن خلدون نے سب سے پہلے ان اسباب کی نشاندہی کی جن کی وجہ سے مورخین سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور ان کی پیش کی ہوئی ماضی کی تعبیریں تحقیق کے اصولوں پر پورا نہیں اترتیں ،اس کی ایک وجہ تو اس نے محققین کی جانبداری بتائی ہے تاریخ میں معروضیت کے جدید مباحث میں یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ علم تاریخ میں نیچرل سائنس جیسی معروضیت تو ممکن نہیں ہاں اگر مورخ غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرے تو کافی حد تک وہ ماضی کی معروضی تعبیر پیش کر سکتا ہے۔دوسری وجہ ابن خلدون نے یہ بتائی کہ مورخ راویوں کی ہر روایت کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ نہیں لیتے۔تیسری وجہ اس نے یہ بتائی کہ مورخ تمدن کے حالات کی حقیقت سے واقفیت حاصل نہیں کرتے ،ابن خلدون کے خیال میں جو شخص اجتماع انسانی پر نظر نہیں رکھتا وہ اس میں فرق نہیں کر سکتا کہ جو روایتیں اسے ملی ہیں وہ اس مخصوص اجتماع انسانی سے موافقت رکھتی ہیں یا نہیں ،اس طرح مورخ واقعات کی تحقیق کا ایک قیمتی ذریعہ کھو دیتا ہے۔ابن خلدون قانون العتیہ (سبب اور مسبب) کے تعلق کو تاریخ نویسی میں اہم تصور کرتا ہے۔

ابن خلدون نے سلطنتوں کے عروج وزوال کے اسباب کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور اس مطالعے کا حاصل اس کی کتاب مقدمہ تاریخ کی شکل میں سامنے آیا جسکے ذریعے ابن خلدون نے ہمیں فلسفہ تاریخ سے بھی روشناس کرایا ،فکری سطح پر ابن خلدون نے سطحی مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ اس نے انسان کے ان نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا

ہے جو فطرت کے اصولوں کے عین مطابق انسان کے سماجی، معاشی اور سیاسی اداروں پر ابتداء سے ہی اثر انداز ہوتے رہے ہیں اس نے سلطنتوں کے عروج و زوال کے اسباب مرتب کرتے ہوئے انسان کی فطرت اور قدیم معاشرے کی ابتداء جیسے موضوعات پر تفصیلی بحث کی ہے اس سلسلے میں اس نے یہ نقطہ بیان کیا ہے کہ انسان فطرتاً جارح ہے اور اپنی فطری جارحیت کو دولت، طاقت اور آرام کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے لیکن یہ فطری جارحیت سرپرستی اور رہنمائی کے بغیر موثر نہیں ہوسکتی۔ معاشرے کی ابتداء قبیلے سے ہوئی، خونی رشتہ قبیلے کے لوگوں کو متحد کرتا ہے اس لیے رہنما کی طاقت اور اثر کی بنیاد بھی خونی رشتہ ہے اس طرح ابن خلدون نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قبیلے میں طاقت حاصل کرنے کے لیے مضبوط عصبیت اولین شرط ہے، عصبیت ایک ایسا جذبہ ہے جو گروہوں کو متحد کرتا ہے، فکری سطح پر ابن خلدون کا نظریہ عصبیت گہرے مطالعہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے اور یہ جذبہ قوموں کے عروج و زوال میں ہر عہد میں کارفرما رہا ہے۔

ہندوستان میں علم تاریخ: محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد سندھ بنو امیہ کی خلافت کا حصہ بن گیا، ہندوستان میں علی کوفی ناصرین قباچہ نے ۱۲۰۶ء تا ۱۲۲۸ء میں چچ نامہ یا فتح نامہ کے نام سے تاریخ کی پہلی کتاب کو عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا، ناقابل یقین کہانیوں کی وجہ سے چچ نامہ کے تاریخی ماخذات نہایت کمزور سمجھے جاتے ہیں، مسلم تاریخ نویسوں نے ہندوستان کے معاشرے کی تاریخ لکھنے کی بجائے اپنے حکمرانوں کی خاندانی داستانوں اور ان کے لشکر کشی کے موضوعات کو تاریخ کا حصہ بنایا جن میں حد درجہ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا، منہاج سراج کی طبقات ناصری اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ ایسی تاریخی روش کی مثالیں ہیں۔

مغلیہ عہد میں بھی اسی قسم کی تواریخ کا چلن جاری رہا لیکن اس عہد کے اختتامی دور میں تاریخ نویسی میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کی بنیادی وجہ مغل حکومت کا زوال تھا مغلیہ حکومت کے زوال کی وجہ سے مورخ درباروں سے نکل کر ادھر ادھر بھٹکنے لگے اور بادشاہ اور اس کے امراء پر تنقید کرنے لگے اس لیے اس دور کی تواریخ میں سیاسی واقعات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی سماجی و معاشرتی زندگی بھی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مرہٹہ، جاٹ، سکھ اور راجپوت اقوام بھی قومی جذبہ کے ساتھ ہم عصر تاریخ کی تشکیل کرنے لگے لیکن اس نوعیت کی تواریخ میں بھی قومی عصبیت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے مغلیہ حکومت کے زوال کے دور میں فقیر خیر الدین محمد الہ آبادی، محمد

قاسم میسوری اور مرزا محمد وغیرہ نے اپنی تاریخوں کا نام عبرت نامہ رکھا ایسی تواریخ میں بادشاہ کی مظلومیت، امراء کی سازشیں اور حکومتی بے بسی کو موثر انداز میں قلمبند کیا گیا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے برصغیر پر قبضہ کے بعد انگریز منتظمین نے ہندوستانی مورخین سے ایسی تواریخ لکھوائیں جن میں برطانوی اقتدار کو جائز ثابت کیا گیا ہے غلام حسین طباطبائی کی سیرت المتاخرین اور کمال الدین زائر کی قصر التواریخ اس قسم کی چند مثالیں ہیں، بعدازاں انگریز مورخین نے بھی تواریخ ہند لکھیں، جیمز مل نے ہسٹری آف برٹش انڈیا ۱۸۲۰ء لکھی اور انگریزوں کی نسلی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی جیمز مل مسلم دور حکومت کو جبر و بربریت کا دور سمجھتا تھا، مارشمن نے اپنی ہسٹری آف انڈیا ۱۸۴۲ء میں لکھی اور اس میں اس بات کا پرچار کیا کہ فتح ہند میں خدا نے انگریزوں کی مدد کی۔ انیسویں صدی کے انگریز مورخوں نے کلائیو، وارن، ہٹنگ اور دوسرے منتظمین پر سخت تنقید کی اور ان کی بدعنوانیوں کو منظر عام پر لے آئے، ایلیٹ کی تاریخ ہندوستان کی تاریخ، ہندوستانی مورخوں کی زبانی ایک اہم تاریخی تصنیف ہے اس میں شاہی خاندانوں کی حکومت کے منفی پہلوؤں پر خوب روشنی ڈالی گئی۔

یہ ہندوستان کی تاریخ کا وہ عہد تھا جس میں ہندو اور مسلمانوں نے مل کر انگریز حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، مغلوں کی زوال آمادہ بادشاہی اس بغاوت کی سرپرستی کر رہی تھی جو کہ بُری طرح ناکام ہوئی، ایک خوں ریز جنگ کے بعد انگریز پوری طرح ہندوستان پر قابض ہو گیا اور یہی سے ہندوستان کی سماجی اور سیاسی صورتِ حال نے نئی کروٹ لی، ہندو مسلم ہر دو قومیں انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے عہد وسطیٰ کے جدید تاریخ نویسوں میں سرسید احمد خان، مولوی ذکا اللہ، شبلی نعمانی، عبدالحلیم شرر محمد حسین آزاد کے نام اہم مقام کے حامل ہیں۔

سرسید احمد خان نے اسبابِ بغاوت ہند لکھ کر مسلمانوں کو انگریز سرکار کی نفرت سے بچانے کی جدو جہد کا آغاز کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو جدید علوم کے حصول کی ترغیب دینے کی بھی کوششیں کیں، اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے انگریزی اسکولوں کے قیام کا بندوبست کیا جہاں مسلمانوں کو جدید مغربی علوم کا درس دیا جاتا تنگ نظر اور متعصب مسلمانوں نے ان کی کھل کر مخالفت کی، اسی زمانے میں انھوں نے آثار الصنادید ۱۸۴۷ء لکھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد آئین اکبری، توزک جہانگیری، اور طبقات ناصری جیسے

اہم تاریخی ماخذات کو ایڈٹ کر کے چھاپا۔

مولوی ذکا اللہ نے تاریخ ہند کے نام سے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ لکھی۔

شرر نے شاعری اور تاریخی ناول نگاری کے ساتھ ساتھ عمومی تاریخ نویسی کے فرائض بھی سرانجام دیئے اس نے سندھ میں عربوں کی فتح کی تاریخ لکھی، ان کی کتاب مشرقی تمدن کی آخری بہار ہمعصر تاریخ ہے۔

شبلی نے سوانح عمری کے میدان میں سیرت النبی ﷺ جیسی اہم کتاب لکھی اس کے علاوہ انھوں نے ادبیات پر بھی اہم کتابیں لکھیں جن میں موازنہ انیس و دبیر کافی مشہور ہے شبلی نے تاریخ نویسی کے سلسلے میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی جہاں پر تاریخی روش میں مغرب مخالفت کا عنصر پروان چڑھتا رہا۔

آزاد نے دربار اکبری لکھی اس میں آزاد نے اکبر کے دور کے مذہبی رجحانات کو اس دور کے علمی و تہذیبی پس منظر میں بیان کیا ہے، دربار اکبری کے علاوہ آزاد نے سخن دان فارس اور آب حیات جیسی معرکہ آراء ادبی تواریخ بھی قلمبند کیں۔

پاکستان میں تاریخ نویسی: پاکستان میں ابتدائی طور پر لکھی جانے والی تواریخ مذہبی اور علاقائی متعصّبانہ نظریات کے ماتحت لکھی گئیں، پاکستان بننے کے بعد ہمارے مورخوں نے حکومتی احکامات کے تحت تاریخی نظریات کو تشکیل دینے کی کوشش کی حکمران طبقوں کے سیاسی مفادات اور اپنے ذاتی نظریات کے تحت کئی تواریخ لکھی گئیں، ابتدائی دور میں بعض تواریخ مغربی مورخوں سے بھی لکھوائی گئیں جن میں قائداعظم محمد علی جناح کی سوانح عمری از ہیکٹر بولیتھو اور پاکستان کے ۵ ہزار سال از موتمر وھیلر نمایاں ہیں، جنرل ایوب خان نے جب اقتدار سنبھالا تو انہوں نے پاکستان کے مورخوں کی ایک میٹنگ بلائی اور اس میں اظہار خیال کیا کہ پاکستان کی تاریخ کو قومی نقطہ نظر سے لکھنا چاہئے اور اس خطے کے قدیم تمدن کے بارے میں تحقیق ہونی چاہئے اس حکومتی مقصد کو پورا کرنے کے لیے اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر احمد حسن درانی اور دوسرے مورخین نے اپنی تواریخ میں پاکستان کو برصغیر کے تاریخی ورثے کا مرکز قرار دیا۔

ایک اور کوشش یہ بھی کی گئی کہ کسی طرح پاکستان کا ثقافتی و تہذیبی تعلق وسط ایشیا سے قائم کیا جائے تاکہ

یہ خطہ ہندو تہذیب سے علیٰحدہ ہو کر مسلم تہذیب کا حصہ بن جائے اس طرح وسط ایشیا سے جو بھی حملہ آور ہندوستان میں حملہ آور ہوئے وہ ہیرو قرار پائے کیونکہ انہوں نے یہاں پر ایک اعلیٰ اسلامی تہذیب کو روشناس کرایا اس عمل کا ایک حکومتی مقصد یہ بھی تھا کہ عالم اسلام سے مل کر بھارت کے خلاف پاکستان کے دفاع کو مضبوط تر کر دیا جائے۔ مذہبی نظریات کے حامل مورخین نے مہنجو داڑو اور گندھارا تہذیبوں کو غیر مسلم تہذیبیں ہونے کی وجہ سے پاکستانی تہذیب کے دائرے میں لانے سے گریز کیا ایسے مورخین نے پاکستان کی تہذیب کا سرآغاز محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے حملوں کو قرار دیا اور ایک زمانے تک بیشتر نصابی اور عام تاریخی کتب میں تاریخ پاکستان کی ابتداء کا یہی نظریہ نمایاں نظر آیا، جدید دور کے مورخوں نے پاکستانی تہذیب کے آثار دوبارہ سے قدیم زمانوں میں تلاش کرنے کی سعی کی اور ایک بار پھر مذہبی و علاقائی حد بندیوں کو توڑ کر تاریخی عمل کو حقیقی وسعت عطا کی پاکستان کے جدید مورخوں میں ڈاکٹر مبارک علی اور یحییٰ احمد کے نام اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے پاکستانی تہذیب وتمدن کی تاریخ کو خالص تاریخی اصولوں کی روشنی میں تشکیل دینے کی کوشش کی۔

ب۔ اردو کی ادبی تاریخ نویسی: آغاز وارتقاء

ادبی تاریخ نویسیؒ کا معاملہ عام انسانی تاریخ کی بہ نسبت کافی پیچیدہ اور دقیق ہے ادبی مورخ کو ماضی کے حالات کی چھان بین کے ساتھ ساتھ تخلیق اور تخلیق کار پر مرتب ہونے والے معاشرتی، سماجی، سیاسی، مذہبی، لسانی، جغرافیائی، اور نفسیاتی اثرات کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے اس کے علاوہ ادبی مورخ کے ذمے یہ کام بھی ہوتا ہے کہ وہ ادیب اور اس کی تخلیقات کا تنقیدی محاسبہ بھی کرے اور ان عوامل کا بھی احاطہ کرے جن سے ادبی ماحول میں کوئی انقلابی تبدیلی رونما ہوئی یا پھر ادبی ماحول سست رفتاری کا شکار ہوا، ادبی تاریخ نویسی میں قدیم مآخذات کی تلاش اور ان کی تحقیق و تدقیق کا مرحلہ سب سے زیادہ مشکل مرحلہ ہوتا ہے، اردو کے ادبی مورخ کے لیے یہ مرحلہ اور بھی زیادہ دشوار ہے کیونکہ اردو زبان و ادب کے قدیم ماخذات کئی ملکوں جیسے پاکستان، ہندوستان، برطانیہ وغیرہ میں بکھرے پڑے ہیں ان مآخذات تک رسائی حاصل کرنا اور ان کی چھان بین کرنا مورخ کے لیے بے حد دشوار ہوتا ہے، پاکستان اور ہندوستان کی ان لائبریریوں میں جہاں یہ مآخذات پڑے ہیں تحقیقی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں جسؒ کی وجہ سے مورخ کو ان مآخذات تک رسائی حاصل کرنے کے بعد بھی بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اردو میں ادبی تاریخ نویسی کا آغاز تذکروں سے ہوتا ہے اگر چہ تذکروں میں تاریخیت کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے لیکن اردو کی ادبی تاریخ نویسی میں تذکرے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اردو کے قدیم شعر و ادب کا کچھ حال اگر کھلتا ہے تو انہی تذکروں کی بدولت کھلتا ہے بعض تذکروں میں شعراء کے حالات زندگی اور اشعار کے نمونوں کے ساتھ ان کے کلام پر تنقیدی بحثیں بھی ملتی ہیں، اٹھارویں صدی کی پانچویں دہائی میں تذکرہ نویسی کی روایت کا آغاز ہوا دیگر ادبی اصناف کی طرح تذکرہ نویسی کی روایت بھی اردو ادب میں فارسی سے آئی یہی وجہ ہے کہ ابتدائی تذکرے فارسی تذکروں کے طرز پر اور فارسی زبان میں لکھے گئے، تذکروں سے پہلے اہل علم اپنے ذوق کی تشفی کے لیے مختصر بیاضیں لکھ رکھتے جن میں شعراء کے منتخب اشعار درج ہوتے، یہ ایک طرح کا شعری انتخاب ہوتا تھا انہی بیاضوں کی بنیاد پر آگے چل کر تذکروں کی روایت کا آغاز ہوا۔تذکرے کو بیاض کی ترقی یافتہ صورت بھی کہا جاتا ہے بعض محققین کے خیال میں پہلے بیاضوں کا رواج عام ہوا اور پھر بعد میں انہی بیاضوں میں شعراء کے حالات زندگی اور کلام پر رائے زنی کے عناصر نے بیاض کو تذکرے کی صورت دے دی، ڈاکٹر انور سدید اور فرمان فتح پوری نے اس طرح کے خیالات کا اظہار اپنی نگارشات میں کیا ہے، اردو زبان وادب کے بعض محققین نے بیاضوں کو بھی تذکروں میں شامل کر دیا ہے، گارسیں دتاسی اور اسپرنگر کی فہرستوں میں اس طرح کی غلطیاں موجود ہیں تذکرہ نویسی کے حوالے سے اٹھارویں صدی نہایت اہمیت کی حامل ہے اسی صدی کی پانچویں دہائی میں میر تقی میر نے نکات الشعراء لکھ کر تذکروں کی روایت کا آغاز کیا۔

میر تقی میر نے ۱۷۵۲ء میں فارسی زبان میں اردو شعراء کا حال نکات الشعراء کے نام سے لکھ کر باقاعدہ تذکرہ نویسی کی روایت کا آغاز کیا، مولانا محمد حسین آزاد کے بیان کے مطابق میرؔ نے تذکرہ قلمبند کرتے وقت دعواء کیا تھا کہ اس تذکرے میں ایک ہزار شعراء کا حال درج کرے گا لیکن اس میں ۱۰۳ شعراء کا حال ملتا ہے، میر نے اپنے اس تذکرے میں شعراء کے حالات زندگی اور نمونہ کلام کے ساتھ ساتھ شعراء کے کلام پر تنقیدی مباحث بھی قلمبند کیے ہیں، اس طرح ''نکات الشعراء'' تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ سوانحی اور تنقیدی لحاظ سے بھی مآخذ اول کی حیثیت رکھتا ہے۔

خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی بھی اپنا تذکرہ گلشن گفتار ۱۷۵۲ء میں تحریر کیا یہ ایک مختصر سا تذکرہ ہے اس میں صرف ۳۰ شعراء کا مختصر حال درج ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ ان شعراء میں میر تقی میر شامل نہیں

ہیں، اس تذکرے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انتخاب کلام کے طور پر بعض شعراء کی ایک ایک دو دو غزلیں دی گئی ہیں اور مثنوی اور مخمس کے نمونے بھی بعض جگہ دیے گئے ہیں اس میں ۱۵ دکنی اور ۱۵ شمالی شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔

افضل بیگ خاں قاقشال کا تذکرہ تحفتہ الشعراء بھی ۱۷۵۲ء میں ہی تحریر کیا گیا اس تذکرے میں کل ۶۲ شعراء کا ذکر ہے جن میں کئی دکنی شعراء نو دریافتہ ہیں اس تذکرے میں بھی میرؔ و سوداؔ جیسے شعراء کا ذکر نہیں ہے شعراء کے وطن اور جائے سکونت کا ذکر تو اس تذکرے میں موجود ہے لیکن شعراء کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ نکات الشعراء، گلشن گفتار، اور تحفتہ الشعراء تینوں تذکرے ایک ہی سن یعنی ۱۷۵۲ء میں لکھے گئے لیکن بعض تاریخی شواہد کی بنیاد پر محققین میر تقی میرؔ کے تذکرے نکات الشعراء کو پہلا تذکرہ قرار دیتے ہیں۔

تذکرہ ریختہ گویاں یہ تذکرہ ''فتح علی حسین گردیزی'' نے ۱۷۵۳ء میں لکھا اس تذکرے میں ۱۹۸ ایسے شعراء کا ذکر موجود ہے جن کا ذکر میرؔ کے نکات الشعراء میں نہیں ہے۔

مخزن نکات اس تذکرے کو قیام الدین قائم چاند پوری نے ۱۷۵۴ء میں تحریر کیا، اس میں کل ۱۲۸ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے اس تذکرے کی زبان بھی فارسی ہے مخزن نکات میں دکنی شعراء کو خاصی اہمیت دی گئی ہے اور اس تذکرے میں شاعروں کو تین طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے یوں پہلی مرتبہ اردو شاعری کی تاریخ میں ادوار بندی کی گئی۔

تذکرہ شعرائے اردو میرحسن دہلوی تذکرہ شعرائے اردو کے مصنف ہیں ان کی ایک مثنوی سحرالبیان بھی ان کی پہچان کا ذریعہ ہے، تذکرہ شعرائے اردو سن ۱۷۷۷ء میں فارسی زبان میں لکھا گیا ،اس تذکرے میں میرحسن نے اردو شعراء کا مقابلہ فارسی شعرا کے ساتھ کیا اس میں کل ۳۰۴ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔

تذکرہ گلزار ابراہیم علی ابراہیم خاں خلیل نے یہ تذکرہ ۱۷۸۴ء فارسی زبان میں لکھا، جس میں اردو کے ۳۲۰ شعراء کا ذکر مع نمونہ کلام دیا گیا ہے، اس تذکرے میں پہلی مرتبہ شعراء کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اس کے علاوہ شعراء کے احوال کی صحت کے حوالے سے بھی تذکرے کو خاصی اہمیت حاصل ہے

گلشنِ بے خار اس تذکرے کے مصنف نواب محمد مصطفٰی خاں شیفتہ ہیں، شیفتہ اردو کے نامور شاعر تھے ان کو مومن خان مومن اور مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تلمذ حاصل رہا۔ یہ تذکرہ مولانہ آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے ادارے دہلی اردو اخبار کے زیر اہتمام اکتوبر ۱۸۳۷ء میں چھپا، شیفتہ نے تقریباً ڈھائی سال کے عرصے میں اس تذکرے کو مکمل کیا ۱۸۷۴ء میں اسے مطبع نول کشور کی جانب سے شائع کیا گیا، شیفتہ نے اپنے تذکرے میں اردو شعراء کی شاعری پر مفصل انداز میں تنقیدی گفتگو کی ہے۔

گلشن ہند یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے جو فارسی کے بجائے اردو زبان میں لکھا گیا، اس کے مصنف مرزا علی لطف ہیں انہوں نے یہ تذکرہ فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما پر قلمبند کیا ڈاکٹر گلکرسٹ نے مرزا علی لطف کو فارسی کی بجائے اردو زبان میں اردو شعراء کا تذکرہ لکھنے کی ترغیب دی، یہ تذکرہ ۱۸۰۱ء میں لکھا گیا اس تذکرے میں ۳۶۹ شعراء کا حال درج ہے بعض محققین کے مطابق یہ تذکرہ میر امن کی ''باغ و بہار سے بھی قبل لکھا گیا ہے یوں یہ تذکرہ اردو نثر کے ایک قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے، تاریخی مواد کے لحاظ سے یہ تذکرہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ محققین ادب اس تذکرے کو علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے گلزار ابراہیم کا ترجمہ قرار دیتے ہیں۔

مجموعہ نغز میر قدرت اللہ قاسم کا مجموعہ نغز بھی ایک اہم تذکرہ ہے اس تذکرے کی زبان فارسی ہے یہ تذکرہ ۱۸۰۷ء میں تحریر کیا گیا اس میں کل ۶۹۶ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے، محمد حسین آزاد کی کتاب آب حیات کا ایک اہم ماخذ مجموعہ نغز ہے۔

تاریخ ادب ہندوستانی اس کتاب کے مصنف فرانسیسی مورخ گارسیں دتاسی ہیں پیرس میں قیام کے دوران انہوں نے عربی، فارسی، اور ترکی کی تعلیم حاصل کی، اور انگلستان میں اردو کی تعلیم حاصل کی، انہوں نے تاریخ ادب ہندوستانی فرانسیسی زبان میں تصنیف کی یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اردو ادب کے محققین اس کتاب کو تذکروں میں شمار کرتے ہیں یوں یہ سب سے ضخیم تذکرہ بن جاتا ہے، گارسیں دتاسی نے اس تذکرے کے مقدمے میں زبان اردو کی پیدائش، مزاج اور رسم الخط کے مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، اسطرح سے اگر اس تذکرے کو اردو ادب میں تاریخ نویسی کا سنگ بنیاد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، مولوی کریم الدین اور فیلن نے اس تذکرے کا اردو ترجمہ تذکرہ طبقات الشعراء ہند کے نام سے ۱۸۴۸ء میں کیا، اس ترجمے

میں کریم الدین اور فیلن نے متعدد اضافے بھی کیے۔

تذکرہ آثار شعرائے ہنود منشی دیبے پرشاد نے اردو کے ہندو شعرا کے احوال پر مبنی تذکرہ آثار شعرائے ہنود لکھا، یہ تذکرہ ۱۸۸۵ء میں بھوپال سے شائع ہوا، پرشاد نے اپنے تذکرے کو دو حصوں میں تقسیم کیا پہلے حصے میں ہندو شعرا کا فارسی کلام شامل کیا اور دوسرے حصے میں اردو کے ۶۵۸ شعرا کا نمونہ کلام مع مختصر احوال درج ہے، تذکرے کے آغاز میں ایک صحت نامہ اور شعرا کا احوال نامہ بھی دیا گیا ہے۔

تذکرہ یورپین شعرائے اردو محمد سردار علی نے یہ تذکرہ اردو کی ادبی تاریخ نویسی کے باقاعدہ آغاز کے بعد ۱۹۴۴ء میں لکھا جو ''ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد سے شائع ہوا۔ اس تذکرے میں اردو کے ۳۷ انگریز شعرا کا حال اور نمونہ کلام درج ہے ان تذکروں کے علاوہ اردو کے جو اہم تذکرے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

☆ عیار الشعراء، ۱۷۹۸ء از خوب چند ذکاء، اس میں شعراء کی تعداد ۸۵ ہے۔

☆ تذکرہ سراپا سخن ۱۸۶۱ء از میر محسن علی محسن لکھنوی، اس تذکرے میں ۳۱۷ شعراء کا ذکر ہے۔

☆ تذکرہ ہندی، ۱۷۹۴ء از مصحفی۔

☆ ریاض الفصحاء، ۱۲۲۱ھ از مصحفی۔

☆ چمنستان شعراء، ۱۷۷۴ء از لچھمی نرائن شفیق۔

☆ تذکرہ شورش، ۱۷۷۷ء از غلام حسین شورش۔

☆ گل عجائب، ۱۷۷۸ء از اسد علی خاں تمنا۔

☆ شمیم سخن، ۱۸۷۲ء از محمود عبدالحئ صفا۔

☆ گلشن ہند، از حیدر بخش حیدری۔

☆ تذکرہ جلوہ خضر، ۱۸۸۴ء از سید صغیر بلگرامی۔

☆ بہارستان ناز، ۱۸۶۴ء از حکیم فصیح الدین رنج،

☆ تذکرہ چمن انداز، ۱۸۷۸ء از درگا پرشاد نادر،

☆ تذکرہ نادری، ۱۸۸۴ء از مرزا کلب حسین نادری۔

ان میں آخری تین تذکرے ایسے ہیں جن میں صرف خواتین شاعرات کا احوال درج ہے۔

ڈاکٹر انور سدید تذکرہ نویسی کی روایت کے محرکات یوں بیان کرتے ہیں:

> تذکرہ نگاری کے محرکات میں تالیف کی صورت میں اپنی یادگار چھوڑ جانے کا جذبہ اپنے ذوق کے مطابق منتخب اشعار جمع کرنے کی خواہش، معاصر شعراء پر رائے زنی، اصلاح ،تبصرہ اور تنقید کے علاوہ معاصرانہ چشمک کی تسکین اور اردو کو فارسی کے ہم پلہ بنانے کی آرزو شامل ہے(۳)

اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں مستشرقین کی خدمات بھی قابل قدر ہیں خاص کر ڈاکٹر گلکرسٹ، اسپرنگر، فیلن، گریرسن، ٹیلر اور گارسیں دتاسی کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ان اصحاب نے اپنی ذاتی دلچسپی اور رغبت کے تحت اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی اور اردو زبان و ادب کے بارے میں مفید کتب تحریر کیں، ڈاکٹر گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں اردو کے مستند عالموں کو جمع کر کے ان سے اردو زبان و ادب کے حوالے سے مفید کام کروائے، اور خود بھی اس کار خیر میں مصروف رہے گریرسن نے ہندوستان کی لسانی تاریخ کو کھنگالا، اسپرنگر اور ٹیلر نے اردو زبان و ادب کی تدریس میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں، گارسیں دتاسی نے تاریخ ادبیات ہندوستانی جیسی تصنیف اردو ادب کو دی، ان اصحاب کا نام اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آب حیات محمد حسین آزاد نے ۱۸۸۱ء آب حیات لکھ کر تذکرہ نویسی کی روایت کو اک نیا موڑ دیا آزاد نے پہلی مرتبہ اپنے تذکرے میں اردو زبان کی تاریخ اس کی پیدائش و ترقی اور اردو شعرا کے حالات مفصل بیان کیے آج اردو ادب کی تاریخ نویسی کی روایت میں آزاد کا تذکرہ آب حیات اہم مآخذ کی حیثیت رکھتا ہے یہ کتاب تذکرہ نویسی اور اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی روایت کے درمیان پل کی حیثیت رکھتی ہے، کتاب کے ابتدائی حصے میں اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء پر بحث کی گئی ہے محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اردو

شعراء کی تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور:

ولی دکنی سے شروع ہو کر مصطفیٰ خاں یک رنگ پر ختم ہوتا ہے۔

دوسرا دور:

شاہ حاتم سے شروع ہو کر اشرف علی خاں فغاں پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرا دور:

مرزا جانجاناں مظہر سے شروع ہو کر میر تقی میر پر ختم ہوتا ہے۔

چوتھا دور:

شیخ قلندر بخش جرات سے شروع ہو کر شیخ غلام ہمدانی مصحفی پر ختم ہوتا ہے۔

پانچواں دور:

شیخ امام بخش ناسخ سے شروع ہو کر میر ببر انیس کے ذکر پر خاتمے کو پہنچتا ہے۔

آب حیات کی پہلی اشاعت کے ساتھ ہی ادبی حلقوں میں ہنگامہ آرائی کی فضا استوار ہوگئی، محققین و ناقدین ادب نے آزاد کی آب حیات کو لے کر آسمان سر پر اٹھا لیا صورت حال بھی کچھ ایسی بنی کہ معترضین کا شکوہ بھی بجا نظر آنے لگا، مومن خان مومن کا ذکر نہ کرنے پر آزاد پر فرقہ وارانہ تعصب کا الزام عائد کیا گیا اس کے علاوہ اپنے استاد شیخ ابراہیم ذوق کی بے جا تعریف اور غالب کو نظر انداز کر دینے پر بھی ادبی حلقوں نے خوب شور شرابہ کیا، بلا آخر محمد حسین آزاد کو آب حیات پر نظر ثانی کر کے ۱۸۸۳ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کرانا پڑا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری آب حیات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> مومن جیسے ممتاز غزل گو شاعر کو پہلے ایڈیشن میں نظر انداز کر دینے اور ذوق کو سارے شاعروں سے افضل و برتر ظاہر کرنے کے نتیجے میں ان پر ہر طرف سے لے دے ہوئی آخر کار انہیں ''آب حیات'' پر نظر ثانی کرنی پڑی (۴)

محمد حسین آزاد نے آب حیات کے مواد کی جمع آوری کے لیے بہت محنت سے کام کیا اس وقت آزاد کے پاس چند ہی تذکرے موجود تھے انہوں نے قریب العہد اور اپنے ہم عصر شعراء کے حالات جمع کرنے کے لیے ہندوستان بھر کے اہل علم وفن کو خطوط لکھے اور ملاقاتوں کے ذریعے زبانی معلومات اکھٹی کیں، اور ایک شاندار تذکرہ ترتیب دیا جس نے اردو ادب میں تاریخ نویسی کی راہیں روشن کیں، جدید دور کے بعض محققین کو آزاد کے افسانوی انداز تحریر سے شکایت ہے ان کا کہنا ہے کہ آب حیات کا انداز تاریخی کم اور افسانوی زیادہ ہے، کچھ کو اس کی تنگ دامنی کا گلہ ہے اور کچھ اصحاب کو اس میں موجود واقعات کی صحت پر شبہ ہے ان بیانات میں کسی حد تک سچائی بھی ہے لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ جب آزاد آب حیات لکھ رہے تھے تو اس وقت اردو زبان وادب میں تحقیق کی کیا صورت حال تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ادب میں ابھی تذکرہ نگاری کی روایت زندہ تھی، اردو ادب کے قدیم ماخذات گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے تحقیق وتدوین کے مسائل پر پیش رفت ہونا ابھی باقی تھا، مواصلات اور آمد ورفت کے ذرائع ناپید تھے ایسے میں آزاد نے آب حیات جیسی تصنیف اردو ادب کو دی ہے تو اس کو غنیمت جاننا چاہئے۔

اس کتاب میں کچھ خامیاں بھی موجود ہیں لیکن تمام تر خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اس کتاب کی اہمیت وافادیت سے انکار کی گنجائش نہیں کیونکہ یہی کتاب اردو ادب میں تاریخ نویسی کا سر آغاز ہے، محمد حسین آزاد ادبی تاریخ کا گہرا شعور رکھتے تھے انہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ادب کے معماروں کے حالات وواقعات کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرنا از حد ضروری ہے انہوں نے اس کام کو اپنا علمی فریضہ سمجھ کر دن رات کی انتھک محنت سے پایہ تکمیل کو پہنچایا، اس کتاب کی زبان شستہ اور اسلوب بیان سلیس ہے شاعروں کے دلچسپ واقعات قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتے ہیں، آب حیات سے پہلے بھی اردو شعراء کے بارے میں کئی تذکرے لکھے جا چکے تھے لیکن تذکروں میں موجود معلومات مبہم اور مختصر تھیں یعنی یہ تذکرے ادھورے پن کا شکار تھے، ایسے میں محمد حسین آزاد نے آب حیات میں شعراء کے حالات زندگی کا بھرپور احاطہ کیا اور حتی الا امکان تاریخی ماخذات کی چھان بین سے اس میں تاریخیت کا عنصر داخل کرنے کی سعی کی یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی۔ محمد حسین آزاد آب حیات کے دیباچے میں اس کتاب کی تصنیف کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نئے تعلیم یافتہ جن کے دماغوں میں انگریزی لالٹینوں کی روشنی پہنچتی ہے وہ ہمارے تذکروں کے اس نقص پر حرف رکھتے ہیں کہ ان سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی سرگزشت کا حال معلوم ہوتا ہے نہ اس کی طبیعت اور عادات واطوار کا حال کھلتا ہے، نہ اس کے کلام کی خوبی اور صحت وسقم کی کیفیت کھلتی ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی، انتہا یہ کہ سال ولادت اور سال وفات تک بھی نہیں کھلتا۔۔۔غرض خیالات مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیات جاوداں حاصل ہو(۵)

محمد حسین آزاد کی آب حیات کے بعد اسی طور سے چند اور تذکرے بھی لکھے گئے ان میں خمخانہ ء جاوید از لالہ سری رام، گل رعنا از عبدالحئ ندوی، شعر الہند از عبدالسلام ندوی، اور محمد یحییٰ تاباں کا تذکرہ سیر المصنفین اہم ہیں، مذکورہ بالا تذکروں میں شعراء کے ساتھ ساتھ اردو نثر نگاروں کا احوال اور زبان کے آغاز وارتقاء کے مسائل بھی زیر بحث لائے گئے، اردو ادب کے محققین ان تذکروں کو جدید تذکروں میں شمار کرتے ہیں، اب تک لکھی جانے والی ادبی تاریخوں میں ان تذکروں کو بنیادی ماخذات کے طور پر لیا گیا ہے۔

خمخانہء جاوید، تذکرہ ہزار داستان جو کہ خمخانہء جاوید کے نام سے معروف ہے ایک عالی شان اور ضخیم تذکرہ ہے اس کے مصنف ''لالہ سری رام'' ہیں یہ تذکرہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد ۱۹۰۴ء دوسری ۱۹۱۰ء، تیسری ۱۹۱۵ء چوتھی ۱۹۲۶ء اور پانچویں جلد ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی، اس تذکرے کو ''برجموھن دتاتریا کیفی نے مرتب کیا، رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں اس کی آٹھ جلدیں بتائی ہیں اس تذکرے کی تعریف وتوصیف میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

اتمام واختتام کے بعد یہ تذکرہ بے نظیر و بے عدیل الحق ہوگا اور نظم اردو کا انسائیکلو پیڈیا یعنی قاموس الاعظم کہلائے جانے کا بے شک مستحق ہوگا کیوں نہ ہو یہ قابل مصنف ''لالہ

سری رام" صاحب کی عمر بھر کی محنت اور ہمارے عہد کی بہترین ادبی خدمت ہے تمام
تذکرہ نویس اس زمانے کے اس کے مرہون منت اور خوشہ چیں ہیں۔(۶)

گل رعنا اس تذکرے کے مصنف "عبدالحئی ندوی ہیں اور یہ تذکرہ آب حیات کے بعد ۱۳۴۰ھ میں لکھا گیا، اس تذکرے میں بیسویں صدی کے ان شعرا کو بھی جگہ دی گئی جن کا ذکر آب حیات میں نہیں ملتا، اس تذکرے میں عبدالحئی ندوی نے جگہ جگہ آزاد کی آب حیات کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور ہر طرح سے آزاد کے خیالات و بیانات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تنقید کا پہلو اس تذکرے میں تشنہ معلوم ہوتا ہے بعض محققین اس تذکرے کو آب حیات کی نقل قرار دیتے ہیں۔

شعر الہند اس تذکرے کے مولف "عبدالسلام ندوی ہیں یہ تذکرہ ۱۹۲۵ء میں لکھا گیا اس کی دو جلدیں ہیں عبدالسلام ندوی نے اس تذکرے میں شاعری کے چار ادوار مقرر کیے ہیں، اول متقدمین، دوم متوسطین، سوم متاخرین اور آخر میں دور جدید کے عنوان سے ایک دور قائم کیا گیا ہے اس تذکرے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں غزل گو شعراء کے ساتھ ساتھ نظم کے شاعروں کا حال بھی درج ہے، اس تذکرے میں تنقید کا پہلو موجود ہے لیکن اس کا حق احسن طریقے سے ادا نہیں کیا گیا تنقیدی رو ایک مخصوص دھارے میں بہتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، پھر بھی اس وقت تک کی دوسری تواریخ کی کتب کے مقابلے میں اس تذکرے میں تنقیدی شعور کی جھلک کہیں زیادہ نظر آتی ہے مصنف نے اس تذکرے میں اردو زبان و ادب کے تاریخی اور لسانی پہلوؤں کی طرف خصوصی توجہ کی ہے، عبدالسلام ندوی نے شعرالہند میں پہلی مرتبہ لکھنو اور دلی کے شعری دبستانوں کا تصور قائم کیا، اور اسی تصور کے اثرات کے تحت آگے چل کر لکھنو کا دبستان شاعری اور دلی کا دبستان شاعری جیسی کتب تحریر کی گئیں، اس وقت کے موجود وسائل کے لحاظ سے یہ تذکرہ ایک اچھی تحقیقی کاوش ہے۔

سیر المصنفین از محمد یحییٰ تنہا مولوی محمد یحییٰ تنہا نے آب حیات کے طرز پر ۱۹۱۴ء میں نثر نگاروں کا تذکرہ سیر المصنفین قلمبند کیا، اس کتاب میں انہوں نے اردو ادب کے معروف نثر نگاروں کے حالات اور نثری نمونے دیے، فکری اور سماجی محرکات کے حوالے سے یہ کتاب خاصی کمزور ہے تنقیدی پہلو اور تاریخیت کا عنصر بھی مبہم ہے، نثر نگاروں کے حوالے سے یہ کتاب اردو ادب کی اولین کاوش ہے۔

تاریخ ادب اردو: "A History of Urdu Literature" از رام بابو سکسینہ: رام بابو

سکسینہ نے ۱۹۲۷ء میں انگریزی زبان میں، "A History of Urdu Literature" کے نام سے اردو کی ادبی تاریخ قلمبند کی، اس کتاب کو مرزا محمد عسکری نے ۱۹۲۹ء میں تاریخ ادب اردو کے نام سے اردو زبان میں ترجمہ کیا، محققین اردو ادب اس کتاب کو اردو زبان و ادب کی پہلی باقاعدہ تاریخ کے طور پر تسلیم کرتے ہیں، یہ کتاب اردو ادب کی پہلی تاریخ ہے جس میں اردو کے شاعروں کے ساتھ ساتھ نثر نگاروں کے حالات زندگی قلمبند کیے گئے اور اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی، شعراء اور نثاروں کے علاوہ اس کتاب میں ادبی عروج و زوال کا سبب بننے والی مختلف تحریکوں اور اداروں کا بھی تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا، اردو زبان وادب کے آغاز سے لے کر جنگ عظیم اول تک کا ادبی منظر نامہ اس کتاب میں موجود ہے رام بابو سکسینہ کی یہ کتاب اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی روایت کا سنگ میل ہے جو کہ آنے والے مورخین کے لیے ایک اہم ماخذ ثابت ہوئی۔ رام بابو سکسینہ نے یہ کتاب انگریزی ادب کی تاریخوں سے متاثر ہو کر لکھی، اس حوالے سے رام بابو سکسینہ خود اس کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں۔

> تمثیلی اقتباسات دوسری کتابوں سے نہیں دیئے گئے میں نے یہ فروگزاشت جان بوجھ کر کی ہے اور سند میں پروفیسر سینٹسبری کی کتاب ''مختصر تاریخ انگریزی علم ادب'' کی مثال پیش کر سکتا ہوں جس کے طرز پر میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔(۷)

اس کتاب میں مصنف نے تاریخ نویسی میں تنقیدی اسلوب اپنایا ہے گو کہ مصنف نے اس کتاب میں زیادہ تر تاثراتی تنقید سے کام لیا ہے لیکن دیگر کتب کی نسبت مصنف کا تنقیدی شعور زیادہ پختہ اور وسیع نظر آتا ہے انگریزی تواریخ سے متاثر ہو کر لکھی جانے والی اس کتاب میں تنقید کا وہ تاثراتی پہلو نمایاں نظر آتا ہے جو مشرقی ہے اس میں شعراء کے کلام پر کی گئی تنقید میں تعریف کھل کر کی گئی ہے اور نقائص کی نشاندہی کرتے وقت قدرے اختصار سے کام لیا گیا ہے، ولی جیسے اردو زبان کے قد آور شاعر پر مختصر سی تنقید پر اکتفا کیا گیا ہے سماج اور حالات کے اثرات کے تحت شعراء کے کلام کی تنقیدی پڑتال نہایت مختصر ہے تقابلی تنقید کا دائرہ کار بھی اس کتاب میں مختصر ہے ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں کے مطابق پرکھا جائے تو اس کتاب میں کئی خامیوں کی نشاندہی ہو جاتی ہے، بہر حال ان تمام کمزوریوں کے باوجود اس کتاب کی ہمہ گیری وسعت مواد کی فراوانی، انداز تحقیق و تفتیش اور مغربی و مشرقی ادب کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ کتاب اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی روایت میں اسم اعظم کا

درجہ رکھتی ہے۔

رام بابوسکسینہ نے اس کتاب کو انیس ابواب میں تقسیم کیا ہے جن میں اردو زبان کے آغاز وارتقاء اردو ادب کی ابتداء اور نظم ونثر کی تدریجی ترقی کا تفصیلی خاکہ پیش کیا ہے آخری باب میں زبان کی خوبیوں کے متعلق اہل علم کے نظریات بیان کیے ہیں، کتاب کے آخر میں ''ضمیمہ تاریخ ادب اردو'' کے نام سے ایک باب قائم کیا ہے اور اس میں ،نظر لکھنوی، چکبست لکھنوی، اور علامہ اقبال کے حالات زندگی اور ان کے فن پر روشنی ڈالی ہے، دراصل یہ وہ معلومات ہیں جو انہیں کتاب کی تکمیل کے بعد میسر آئیں اس لیے انہیں الگ ضمیمے کے طور پر کتاب میں شامل کرلیا ہے، اس کتاب کی اصل وجہ تصنیف تو طلباء کے لیے امتحانات کی تیاری کے لیے امدادی مواد فراہم کرنا تھی لیکن کتاب کے اتمام تک اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوگیا اور مصنف کو اردو ادب کی باقاعدہ تاریخ کے طور پر اسے پیش کرنا پڑا، اس بابت رام بابوسکسینہ تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں:

> ابتدائی قصہ تو یہ تھا کہ ادب اردو کی ایک پرائمر (ابتدائی کتاب) کالج کے طلبہ اور عام پبلک کے فائدے کے لیے تیار کی جائے اسی وجہ سے فٹ نوٹ اور حوالوں سے سے کتاب کو وزنی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، ہر چند کہ حسب ضرورت اصل کتابوں کا بخوبی مطالعہ کیا گیا تھا مگر بلاخر یہ اپنے مقررہ حجم سے بڑھ گئی (۸)

تاریخ ادب اردو چونکہ ترجمہ ہے رام بابوسکسینہ کی انگریزی تصنیف "A History Of Urdu Literature" کا اس لیے اس کتاب کو ترجمے کے مسائل کا بھی سامنا رہا مرزا محمد عسکری سے اس کتاب کو ترجمہ کرتے وقت تحریف و اضافت کی لغزشیں ہوئیں بعض مقامات پر مترجم اور مصنف کے نظریات میں اختلاف کا مسئلہ پیش آیا اور بعض مقامات پر مترجم مصنف کی اغلاط کی تصحیح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اگر ترجمہ کاری کے اصولوں کو مدنظر رکھا جائے تو مترجم کو چاہئے کہ وہ مصنف کی اصل عبارت سے ہی غرض رکھے لیکن یہاں مترجم نے اپنے اختلافات کو بھی شامل کتاب کرلیا اور جہاں جہاں اغلاط نظر آئیں وہاں ان کی نشاندہی کرنے کے بجائے ان کی تصحیح کرتے چلے گئے یوں اس ترجمہ وترمیم شدہ کتاب نے اصل کتاب کی جگہ لے لی اور قبولیت عام حاصل کرلی، رام بابوسکسینہ کی اس کاوش اور محنت کے نتیجے میں اردو زبان و ادب میں تاریخ نویسی کا سائنسی بنیادوں پر باقاعدہ آغاز ہوا شعراء اور نثاروں کے حالات زندگی، کلام کے نمونوں اور ان پر تنقیدی مباحث کے

علاوہ زبان کے آغاز وارتقاء، رسم الخط، اصناف سخن، اردو زبان کے دیگر زبانوں کے ساتھ تال میل اور اردو زبان کی سماجی اہمیت جیسے موضوعات نے اس کتاب کو تاریخی ولسانی اعتبار سے اہمیت کا حامل بنا دیا ہے، آج کم وبیش اردو ادب کے تمام محققین اس کتاب کو اردو کی ادبی تاریخ نویسی کا سر آغاز مانتے ہیں۔

"A History Of Urdu Literature" از "گراہم بیلی": گراہم بیلی کی یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی، سید محمد عظیم نے اس کتاب کا ترجمہ ۱۹۹۳ء میں دہلی یونیورسٹی کے ترجمے کے ڈپلومہ کے لیے کر کے شائع کیا اس کتاب کے چار ابواب ہیں، مصنف نے اس کتاب میں مختلف ادوار کے ادبی رجحانات، تحریکوں، شعراء، ادباء اور ان کے فن پر روشنی ڈالی ہے، جدید شعراء کے ذکر کے ساتھ بعض شعراء کے کلام کا انگریزی ترجمہ بھی دیا ہے۔

مختصر تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر اعجاز حسین: ڈاکٹر اعجاز حسین نے ۱۴ دسمبر ۱۹۳۷ء میں مختصر تاریخ ادب اردو لکھی یہ کتاب الہ آباد سے شائع ہوئی اپنی اس کتاب میں ڈاکٹر اعجاز حسین نے اہم شعراء اور نثاروں کے حالات زندگی اور ان کے فن پر غیر جانبدارانہ بحث کی ہے، علامہ اقبال کے زمانے تک کے ادبی سفر کی روداد اس کتاب میں شامل ہے، اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مصنف نے نظم کے گیارہ ابواب اور دوسرے حصے میں نثر کے آٹھ ابواب مقرر کیے ہیں اس کتاب میں مصنف نے جدید شعراء اور نثاروں کا بھی ذکر کیا ہے، یہ کتاب اردو ادب کی پہلی مختصر تاریخ ہونے کا اعزاز بھی رکھتی ہے، اس سے پہلے "گراہم بیلی" نے بھی ایک مختصر تاریخ لکھی لیکن وہ انگریزی زبان میں تھی۔

تاریخ ادب اردو، از ڈاکٹر محی الدین قاری زور: یہ کتاب ۱۹۴۰ء میں ادارہ ادبیات، دکن سے شائع ہوئی اس کتاب کی ترتیب میں گراہم بیلی کی کتاب اے ہسٹری آف اردو لیٹریچر سے مدد لی گئی ہے مصنف نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے حصے میں اردو زبان وادب کے آغاز وارتقاء کے مباحث شامل ہیں، دوسرے باب میں، دہلی، دکن اور لکھنو میں اردو ادب کا بدلتا منظر نامہ دکھایا گیا ہے اور تیسرے باب میں جدید ادبی ماحول پر روشنی ڈالی گئی ہے، بعض جگہوں پر مصنف نے گراہم بیلی کی کتاب کی عبارت ہو بہو نقل کی ہے۔

"A History of urdu literature" از ڈاکٹر محمد صادق: ڈاکٹر محمد صادق نے یہ کتاب

۱۹۵۷ء میں لکھی اور ۱۹۶۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن سے انگریزی زبان میں شائع ہوئی اردو ادب کی انگریزی زبان مین لکھی گئی تاریخوں میں یہ کتاب سب سے زیادہ مستند اور جامع تاریخ ہے یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصے میں اردو زبان کا تاریخی منظر نامہ اور اس کے ارتقاء پر تحقیقی وتنقیدی بحث شامل ہے، اردو زبان کے شعری سفر کے ذیل میں، دلی، لکھنو، گولکنڈہ، بیجاپور، اور دکن کے نامور شعراء کا تفصیلی حال بیان کیا گیا ہے، دوسرے باب میں مصنف نے اردو نثر نگاری کے آغاز وارتقاء، تحریک علی گڑھ، اور آب حیات پر روشنی ڈالی ہے، مصنف نے ولی کو اردو زبان کا پہلا شاعر قرار دیا ہے اور ولی کے چند اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی کتاب میں شامل کرلیا ہے۔

تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر جمیل جالبی: ڈاکٹر جمیل جالبی کی زندگی بھر کی تحقیق وتدقیق کا ثمرہ انکی تصنیف تاریخ ادب اردو ہے انہوں نے بہت محنت اور مسلسل جدوجہد سے اس کام کو پایہء تکمیل تک پہچایا، چار جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں جمیل جالبی نے آغاز سے لے کر اب تک کے سارے ادبی منظر نامے کا احاطہ نہایت شاندار طریقے سے کیا ہے، بسیط تو ریخ ادب کے حوالے سے، علی گڑھ یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی جیسے اداروں کی ناکامی کا جائزہ لیا جائے تو اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا کام کس قدر اہمیت کا حامل ہے، فرد واحد کی حیثیت سے ان کی اس کاوش کو سراہنا لازم ہے کہ انہوں نے اس مشکل کام کو اکیلے ہی نہایت خوبی کے ساتھ انجام کو پہنچایا۔

اس کتاب کی پہلی جلد ۱۹۷۵ء، دوسری جلد ۱۹۸۴ء، دو حصوں میں، تیسری جلد ۲۰۰۷ء میں اور چوتھی جلد ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی، چار جلدوں میں مکمل ہونے والی ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو تہذیب و روایات، علاقائی ادب کے ارتقاء اور شعر وادب کے اہم ماخذات سے بھر پور ہے۔ اس کتاب میں جالبی نے کم وبیش تمام تاریخی نکات کو سند اور ٹھوس دلائل سے ثابت کرنے کی سعی کی ہے، ادوار بندی زمانی ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسی ہے، اپنی تاریخی روش کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> میں نے ادوار کی زمانی تقسیم کے ساتھ روایت کی تشکیل وتعبیر اور ردعمل وتبدیلی کو بنیادی طور پر سامنے رکھا ہے تاکہ زمانی ترتیب، روایت کا سفر اور روح ادب بیک وقت سامنے آ جائیں، جدید ادبی تاریخ کے ادوار کی تقسیم اسی طرح ہونی چاہئے۔'' تاریخ ادب اردو''

میں میں نے کم وبیش ہر بات کو حوالے اور سند کے ساتھ پیش کیا ہے، یہاں آپ کو تنقید کی مختلف صورتیں ملیں گی، تحقیقی ومعروضی بھی اور نفسیاتی وسماجی بھی، تہذیبی ونظریاتی بھی اور عملی وتجرباتی بھی، تشریحی ولسانیاتی بھی اور اخلاقی و جمالیاتی بھی (۹)

اس کتاب کی پہلی جلد ۱۲۷ صفحات پر مشتمل ہے جالبی نے پہلی جلد میں زبان وادب کے آغاز وارتقاء سے لے کر ولی دکنی کے زمانے تک کے ادبی منظرنامے کی تفصیلات پیش کی ہیں اس جلد میں اردو زبان کی تشکیل اور ارتقائی عمل کے بارے میں اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں اردو زبان کے بارے میں مصنف کی رائے ہے کہ یہ زبان پاک و ہند کے ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس لیے اس کو کسی ایک علاقے تک محدود و مخصوص کرنا ناانصافی ہے، گجراتی اور دکنی ادب کو جالبی نے سماجی اور ثقافتی حوالوں سے پیش کیا ہے۔

دوسری جلد ۱۱۲۱ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ دو حصوں پر مشتمل ہے اس میں سترویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کے ادبی منظرنامے کو پیش کیا گیا ہے، اس جلد میں جعفر زٹلی، میر حسن اور ان کے معاصرین کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے، مصنف اس نظریے کو رد کرتے ہیں کہ اردو شاعری دور زوال کی پیداوار ہے، وہ اردو زبان کو ایک انقلابی تحریک کے آغاز کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر سلیم اختر: ڈاکٹر سلیم اختر نے ۱۹۶۸ء میں ملتان میں قیام کے دوران اس کتاب کا ڈول ڈالا ۱۹۷۱ء میں یہ کتابی صورت میں سنگ میل پبلکیشنز لاہور سے شائع ہوئی، ابتدائی اشاعت میں اس کتاب کے کل صفحات ۲۵۰ کے قریب لیکن تھے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مصنف اس میں ترمیم واضافہ کرتے رہے اور اب اس کتاب کا حجم اتنا بڑھ گیا ہے کہ ''مختصر ترین'' کا نام اس کے لیے موزوں نہیں رہا حالیہ ایڈیشنوں میں اس کتاب کے صفحات ۷۰۰ سے تجاوز کر گئے ہیں، ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب میں شعراء وادباء پر اپنی تنقیدی آرائیں پیش کی ہیں خاص کر نفسیاتی تنقید کا پہلو جو کہ مصنف کا خاصہ ہے اس کتاب میں نمایاں نظر آتا ہے اس کے علاوہ سماجی اور جمالیاتی تنقید کی جھلک بھی اس کتاب میں نظر آتی ہے، اس کتاب کی اہمیت نصابی حوالے سے بھی بہت زیادہ ہے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، سی ایس ایس، کے امتحانات اور دیگر جامعات میں یہ کتاب نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہے مصنف نے اس کتاب میں اردو زبان وادب کے آغاز وارتقاء، کلاسیکی ادب، مختلف تحاریک، جدید ادبی رجحانات وتصورات، اور پاکستان کے

جدید ادبی ماحول کے مباحث شامل کیے ہیں ڈاکٹر سلیم اختر کے خیال میں ادبی تاریخ کو تنقیدی تناظر میں لکھنا چاہیئے، اس حوالے سے وہ اپنی کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> اردو میں مختلف اسالیب نقد ملتے ہیں، چنانچہ تاریخی، عمرانی، جمالیاتی، نفسیاتی اور مارکسی انداز نظر سے دلچسپی رکھنے والے ناقدین ملتے ہیں لیکن ہماری تمام ادبی تاریخوں کو صرف تاریخ کے طور پر لکھا گیا، یعنی حالات زندگی اور کلام پر تبصرہ اور بس! لیکن کسی ادبی مورخ نے کبھی کسی مخصوص نظام نقد کو تخلیق اور تخلیق کاروں کے لیے محدب شیشہ بنانے کی کوشش نہ کی (۱۰)

اگر ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں کی روشنی میں اس نظریے کو پرکھا جائے تو ڈاکٹر سلیم اختر کے اس نظریے سے اختلاف کی صورت نکل آتی ہے کیونکہ کوئی مورخ کسی خاص دائرہ نقد میں محصور ہو کر ادبی تاریخ نویسی کا حق ادا نہیں کر سکتا، مثلاً اگر کوئی مورخ غالب کے فن کا جائزہ صرف نفسیاتی تنقید کے دائرے میں رہ کر پیش کرتا ہے تو، غالب کی فکری، سماجی اور معاشی زندگی کے ان کے فن پر پڑنے والے اثرات کبھی بھی منظر عام پر نہیں آ سکتے، دوسرا نقطہ اعتراض جو اس کتاب پر اٹھایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مصنف نے تاریخ نگاری کی مطلوبہ سنجیدگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کتاب میں جا بجا انشائی اور ظریفانہ انداز اپنایا ہے جو ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں کے خلاف ہے مثال کے طور پر اس کتاب کے مختلف مضامین کے نام دودھ اور پانی، باغ کا جھاڑ جھنکار، پردہ اٹھتا ہے، شاعری کا جاپانی پھل، ڈرامے کا ڈرامہ، افکار نو کے پرچم، کون سا گیت سنو گی، اور فلسفہ اور تنقید کی مکھیاں، وغیرہ پیش کیے جا سکتے ہیں، تیسرا اعتراض مصنف کے اس مخصوص اور ترش لہجے پر کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنے مخالفین جیسے وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید وغیرہ کے ضمن میں اپنایا ہے، کسی مورخ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے ذاتی تعصّبات کو تاریخ کا حصہ بنانے کی کوشش کرے اگر کسی ایب یا ادب پارے پر کوئی اعتراض ہو تو مورخ کو چاہیئے کہ وہ تاریخ اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے ان نقائص کی نشاندہی کرے جو اس کو نظر آئے ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ از ڈاکٹر تبسم کاشمیری: حالیہ دور میں لکھی جانے والی ادبی تواریخ میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اردو ادب کی تاریخ بھی ایک اہم ادبی تاریخ کی کتاب ہے، یہ کتاب ۲۰۰۳ء میں سنگ میل

TH 21436

پبلیشرز کے زیر اہتمام شائع ہوئی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس کتاب کی بنیاد جدید ادبی اصولوں پر استوار کی ہے ،اور ابتداء سے انجام تک ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے، انہوں کے اس کتاب میں نظم ونثر کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے دونوں کا جائزہ ساتھ ساتھ پیش کیا ہے، اس کے علاوہ اس کتاب کی ایک اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف نے کتاب کے آخر میں بہمنی سلطنت، بیجاپور، گولکنڈہ، اودھ، مغلیہ دور حکومت اور نظام شاہی ریاست کے عہد حکومت کی زمانی ترتیب اور سنین کی تفصیلات بھی دی ہیں اس کے علاوہ مقامات، کتب اور اسماء وادارہ جات کے اشاریے بھی دیے ہیں اور کلاسیکی دور ادب کی تفہیم کے لیے جغرافیائی نقشوں کی مدد بھی فراہم کی ہے، ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا تصور تاریخ فرانس کے مکتبہ فکر، اینلس سکول سے ملتا ہے اسی لیے ان کی تاریخ میں تحقیق وتنقید کا ایک متوازن بہاو نظر آتا ہے، اس کتاب کو انہوں نے جاپان میں رہ کر مکمل کیا ہے لیکن ہر ممکن قدیم ماخذات اور جدید ادبی تصورات ونظریات سے استفادہ کیا ہے، مجموعی طور پر یہ کتاب جدید ادبی تاریخ نویسی کی ایک عمدہ مثال ہے۔

اے ہسٹری آف اردو لٹریچر ازعلی جوادزیدی: علی جوادزیدی نے انگریزی میں اردو ادب کی تاریخ لکھی، جو ساہتیہ اکادمی دہلی سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی، یہ کتاب ابتدائیے کے علاوہ کل ۴۵۹ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۳۲ ابواب قائم کیے گئے ہیں، کتاب کے پیش لفظ میں مصنف نے ساہتیہ اکادمی کی ہدایات کے حوالے سے پاکستانی اردو ادب سے صرفِ نظر کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر گیان چند جین اور دیگر محققین نے اس تاریخ کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے

اجتماعی تاریخیں: اردو ادب میں بعض ایسی تواریخ بھی ہیں جن کو مختلف محققین نے مل کر ترتیب دیا، ایسی تواریخ میں، علی گڑھ تاریخ ادب اردو علی گڑھ یونیورسٹی، اور تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، اہم ہیں، علی گڑھ کی تاریخ کی پہلی جلد کی اشاعت کے ساتھ ہی اس پر محققین ادب اردو نے اعتراضات کی بارش کر دی اس کتاب میں اتنی غلطیاں نکل آئیں کہ ایک غلط نامہ اس کے ساتھ چسپاں کرنا پڑا اور اس کا باقی کام ادھورا ہی رہ گیا۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند کو پنجاب یونیورسٹی نے شائع کروایا، منصوبہ تو پایہء تکمیل کو پہنچا لیکن اس میں بھی اغلاط کی بھرمار ہے، مختلف مورخین کے نظریاتی اختلافات کی وجہ سے اس کتاب کی تاریخیت بری طرح مجروح ہوگئی ہے، ڈاکٹر رشید حسن خان نے ایسی تواریخ کو'' پنچائتی

تواریخ'' کا نام دیا ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر نے تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند کو ''حکایات عجیب و غریب اور لطائف دل پذیر'' کہا ہے۔

تاریخ ادب اردو ازسیدہ جعفر، گیان چند جین: پروفیسر سیدہ جعفر اور گیان چند جین کے اشتراک سے لکھی گئی یہ ادبی تاریخ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اور اسے قومی قونسل برائے فروغ اردو دہلی، بھارت کے زیر اہتمام ۱۹۹۸ء میں شائع کیا گیا، اس کتاب کا زیادہ تر مسودہ پروفیسر سیدہ جعفر نے تیار کیا ہے ڈاکٹر گیا چند جین نے مقدمے کے علاوہ اس کتاب میں ۲۰۳ صفحات کا اضافہ کیا ہے۔

تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند: اس ادبی تاریخ کا منصوبہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں بنایا گیا، ادارے نے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے ایک سات رکنی کمیٹی تشکیل دی جس کے سربراہ پروفیسر علاؤ الدین صدیقی تھے، اس کی کل ۱۹ جلدیں ہیں جو مکمل کر لی گئی ہیں جن میں آخر ہی پانچ جلدیں اردو، بنگالی، علاقائی، فارسی اور عربی ادب کے اشاریے پر مشتمل ہیں، ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب اردو ادب کی تاریخیں میں اس کی کل سولہ جلدیں بتائی ہیں، ان کے خیال میں اس کتاب کی صرف چھ جلدیں اردو ادب سے متعلق ہیں وہ اس تاریخ میں ہندو اور دیگر مذاہب کے اردو ادیبوں کو نظر انداز کیے جانے پر شاکی ہیں، ڈاکٹر رشید احمد خان کے بقول یہ بھی ایک پنچائتی تاریخ ہے جس کی تکمیل میں کئی مشاہیر ادب نے حصہ لیا، اس کتاب کی پہلی جلد ڈاکٹر عبادت بریلوی کی زیر نگرانی ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی جس میں مختلف محققین کے مقالات شامل ہیں۔

علی گڑھ تاریخ ادب اردو: مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے اردو کے شعبے کی طرف سے ایک اجتماعی تاریخ لکھنے کی کوشش کی گئی جو ناکامی کا شکار ہوئی اس ادبی تاریخ کی تکمیل کی ذمہ داری بھی کئی مشاہیر کو سونپی گئی، اس تاریخ کا منصوبہ ۱۹۵۶ء کو منظور کیا گیا لیکن محققین کی سست رفتاری کی وجہ سے اس کی پہلی جلد ۱۹۶۲ء میں چھپ سکی، پہلی جلد کی اشاعت کے ساتھ ہی ناقدین ادب نے اس کتاب میں بہت سی خامیوں کی نشاندہی کر دی جس کی وجہ سے انتظامیہ کو یہ ایڈیشن بازار سے واپس لینا پڑا اور اس کے بعد یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

اجتماعی تواریخ میں سب سے بڑا مسئلہ محققین ادب کے نظریات کے تصادم کا پیش آتا ہے ایک ہی موضوع پر ایک ہی ادبی تاریخ میں کئی آراؤں کا شامل کیا جانا ادبی تاریخ کی حقانیت میں خلل ڈالتا ہے، ایسی تواریخ میں تاریخی تسلسل بھی ناپید ہوتا ہے تاریخی واقعات کے باہمی ربط کا فقدان، مختلف علاقوں میں نمو پانے

والے ادب کے باہمی تعلق کی نامناسب تشریح اور نظریاتی اختلافات جیسی خامیاں ان تواریخ میں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔

ج۔ اردو کی ادبی تاریخ نویسی: اصول وضوابط

اُردو کی ادبی تاریخ نویسی کے ابتدائی آثار بیاضوں کی صورت میں ہمیں ملتے ہیں بیاض ایسی ڈائریاں ہوتیں جنھیں اہل علم اپنے ذوق کی تشفی کے لیے مرتب کرتے ان میں شعراء کا منتخب کلام اور کبھی کبھار مختصر سا تعارف درج ہوتا، انہی بیاضوں کی ترقی یافتہ شکل تذکرے ہوئے، تذکروں میں شعراء کے کلام کے نمونے کے ساتھ ان کے حالات زندگی اور بعض اوقات تنقیدی تاثرات بھی قلمبند کیے جاتے، میر تقی میر نے ۱۷۵۲ء میں نکات الشعراء لکھ کر تذکرہ نویسی کا باقاعدہ آغاز کیا ہے اردو کا پہلا تذکرہ تھا اس کے بعد کئی تذکرے لکھے گئے جن میں اردو شعراء کی تاریخ مرتب ہوتی رہی اور یہ سلسلہ گارسیں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندوستانی سے ہوتا ہوا مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات تک جا پہنچا، آزاد نے آب حیات لکھ کر اردو کی ادبی تاریخ نویسی کو ایک نیا موڑ دیا، یہ کتاب تذکرہ نویسی اور جدید ادبی تاریخ نویسی کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے اس کے بعد رام بابو سکسینہ نے ۱۹۲۷ء میں تاریخ ادب اردو لکھ کر ادبی تاریخ نویسی کا باقاعدہ آغاز کیا، رام بابو سکسینہ کی تاریخ سے پہلے محمد یحییٰ تنہا نے اردو کے نثر نگاروں کے حوالے سے ایک تذکرہ سیر المصنفین ۱۹۱۴ء میں قلمبند کیا، مگر اس تذکرے میں صرف چند چنیدہ نثر نگاروں کا ذکر تھا شعراء کا حال اس کتاب میں درج نہیں تھا، رام بابو سکسینہ نے اردو شعراء اور نثاروں کا حال پہلی مرتبہ ایک ہی کتاب میں قلمبند کیا اس طرح یہ کتاب اردو ادب کی پہلی باقاعدہ تاریخ قرار پائی۔

اب تک اردو ادب کی کئی تواریخ لکھی گئی ہیں جن میں نئے نئے زاویوں سے اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالی جا رہی ہے اور جدید ادبی اصولوں کے تحت قدیم ماخذات کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے، ادبی تواریخ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کو سب سے زیادہ پزیرائی ملی ہے جالبی نے اس کتاب میں روایتی اصولوں سے ہٹ کر جدید سائنسی انداز میں تاریخی حقائق کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے یہ اردو ادب کی واحد تاریخ ہے جس میں تحقیق وتنقید کو توازن دیا گیا ہے ہندوستان کے علاقائی ادب کے اردو ادب پر اثرات، قدیم ماخذات کی نشاندہی، اور ہر معاملے کو دلائل وسند سے سلجھانے کی مصنف کی کوشش نے اس

کتاب کو ممتاز کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو ادبی تواریخ میں خاص مقام حاصل ہے۔

ادبی تاریخ نویسی کے اصولوضوابط کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ آیا ادبی تاریخ بھی عام انسانی تاریخ کے ضمرے میں آتی ہے یا نہیں، اور اگر آتی ہے تو ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ اس پر بھی وہی بنیادی اصول وضوابط لاگو ہونگے جو عام انسانی تاریخ نویسی پر لاگو ہوتے ہیں، خواہ ہم ادبی تاریخ نویسی کو اصناف کے اعتبار سے تقسیم کریں یا شخصیات کے اعتبار سے یا پھر زمانی اعتبار سے اس کی تقسیم کی جائے، ادبی تاریخ نویسی کو مصنف کے ذاتی رجحانات ونظریات اور تعصّبات سب سے زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں تاریخی ماخذات کی چھان پھٹک سے جو درست مواد میسر آتا ہے اسی کو اصل تاریخ کا درجہ دیا جا سکتا ہے مصنفین کے ذاتی نظریات وعقائد اور رجحانات پر مبنی مباحث تاریخ کا حصہ نہیں بن سکتے، ادبی تاریخ نویسی میں ادوار بندی کا معاملہ خاصا پیچیدہ اور توجہ طلب ہوتا ہے ادوار بندی کا مقصد تاریخی واقعات وحالات کو ایک خاص ترتیب سے اس طرح رقم کرنا ہوتا ہے کہ قاری کو سمجھنے میں آسانی ہو کہ کس طرح تاریخ اپنے ارتقاء کا سفر طے کر رہی ہے اور کہاں کہاں ایسے عظیم واقعات وحادثات رونما ہوئے جہاں سے تاریخ ایک نئی جہت پر گامزن ہوئی، تاریخ کی مختلف ادوار میں تقسیم کے باوجود اس کے تاریخی عمل میں تسلسل کا ہونا لازمی ہے اگر ایک دور کے اختتام پر دوسرے دور میں فضا یکسر بدل دی گئی ہو اور تاریخی تسلسل ٹوٹ گیا ہو تو اس میں سے تاریخیت کا عنصر غائب ہو جاتا ہے اور ایسی کتاب تاریخ کی کتاب نہیں کہلائی جا سکتی، ہر دور جو شروع ہوتا ہے منسوب ہے اس دور سے جو ختم ہو رہا ہے اور پیغمبر ہے اس دور کا جو آنے والا ہے، اس طرح مختلف زمانوں کے حالات وواقعات کی کڑیاں آپس میں ملتی جاتی ہیں اور ایک زنجیر کی شکل میں انسانی حیات کی تاریخ مرتب ہوتی رہتی ہے، ایسے مورخوں کی تعداد بہت کم ہے جنھوں تاریخ کو تاریخ سمجھ کر لکھنے کی کوشش کی ہو، تاریخ کی ایک یہ بھی بدقسمتی رہی ہے کہ تاریخ ہمیشہ سے طاقت ور حکمرانوں، مذہبی پیشواوں کے زیر اثر پروان چڑھتی رہی، مورخوں نے بادشاہوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور مذہبی عقائد کے پرچار کی غرض سے تاریخ کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا، بادشاہوں کے زمانے تک لکھی جانے والی تواریخ شاہی قصیدے تک ہی محدود رہیں اس کے بعد کی تواریخ میں مذہبی عقائد اور ذاتی نظریات تاریخی عمل کو ناہموار کرتے رہے۔

اردو کی ادبی تاریخ نویسی میں اگر بات میر تقی میر کے تذکرے ''نکات الشعراء'' سے شروع کی جائے تو

پتہ چلتا ہے کہ میر کا زعم ان کو شعراء پر بے جا تنقید پر اکساتا ہے میر اپنے تذکرے میں ہر دوسرے شاعر پر لعن تعن کرتے نظر آتے ہیں، میر نے ولی جیسے شاعر کو بھی اپنی بے جا تنقید کا نشانہ بنایا ولی کے بارے میں بہت کچھ سخت وسست کہا ایک جملہ جس پر ولی کے خیر خواہ بھڑک اٹھے یہ ہے ''وے شاعر یست از شیطان مشہور تر''۔ یہی سلسلہ ہوتا ہوا محمد حسین آزاد کی آب حیات تک جا پہنچتا ہے اس کتاب میں محمد حسین آزاد نے اپنے متعصّبانہ روّیے کی وجہ سے پوری کتاب میں کسی ہندو یا کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے شاعر کا ذکر نہیں کیا، اردو ادب کی پوری تاریخ میں کیا ایک بھی ایسا غیر مسلم شاعر نہیں تھا جس کے فن کو سراہا جاتا یا اس کو اردو کی ادبی تاریخ میں جگہ دی جاتی، اس کے بعد آزاد نے اپنے استاد شیخ ابراہیم ذوق کی تعریفوں کے جو پل باندھے ہیں اور مومن اور غالب جیسے شاعروں پر مختصر سی رائے دے کر خاموشی اختیار کی ہے اس سے ان کے متعصّبانہ رویے کا پتہ چلتا ہے آزاد کی آب حیات کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے ساتھ ہی ادبی حلقوں میں جو شور وغل اٹھا اس کی بنیادی وجہ بھی آزاد کا متعصّبانہ رویہ ہی تھا اور اسی وجہ سے ان کو جلد ہی اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن متعدد تبدیلیوں اور اضافوں کے ساتھ شائع کرانا پڑا۔ تذکروں کے بعد اگر اردو کی ادبی تاریخوں کا جائزہ لیا جائے تو یہاں بھی کم وبیش ایسی ہی صورت حال نظر آتی ہے، زبان کے آغاز وارتقاء کے بارے میں ہمارے مورخین نے جو نظریات پیش کیے ہیں اور ان کے حق میں جو دلائل دیے ہیں وہ سمجھ سے بالاتر ہیں، ہر مورخ دوسرے کے نظریے کی تردید کرتا اور اپنے نظریے کے حق میں دلائل دیتا نظر آتا ہے اور اس ساری بحث میں مورخین ادب کا جذباتی انداز فکر واضح طور پر نظر آتا ہے کہیں پر یہ جذباتی انداز فکر علاقائی تعصب لیے ہوئے ہے تو کہیں اس پر مذہب کی چھاپ نظر آتی ہے ، یہاں تک کہ محققین اردو ادب نے زبان اردو کے آغاز وارتقاء کے تانے بانے سرحد اور بلوچستان کی بولیوں سے بھی ملانے کی کوششیں کی ہیں، اس ساری دگرگوں صورت حال میں اردو زبان وادب کا قاری اور طالبعلم حیران وپریشان ادبی تاریخوں کی ورق گردانی کرتا نظر آتا ہے مگر مجال ہے کہ اس ساری الجھن کا کوئی حل کہیں کسی کتاب سے مل جائے یوں تو ہر مورخ اپنی کتاب کو خالص سائنسی تحقیق کے اصولوں کے عین مطابق قرار دیتا ہے لیکن اندرون خانہ اپنی من پسند کھچڑی پکاتا ہے اور ادبی تاریخیت کے بخیے ادھیڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا، مورخ کسی مسئلے کے حل کے لیے قدیم ماخذات سے استفادہ کرتا ہے لیکن اس ماخذ کی چھان پھٹک نہیں کرتا اور، اپنی ذاتی دلچسپی کے باعث کسی ایک ماخذ کو درست قرار دے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

اردو میں ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کے حوالے سے بہت کم کام ہوا ہے، جو تھوڑا بہت کام اس

سلسلے میں ہوا ہے اس میں نقل درنقل کی سی کیفیت نظر آتی ہے تمام تر مضامین میں کچھ بنیادی باتوں کو بار بار توڑ مروڑ کر نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جس کی وجہ سے تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کی وضاحت نہیں ہو پاتی، خیر یہ اس کام کی ابتداء ہے اور اس میں بتدریج بہتری کے امکان کو پیش نظر رکھا جا سکتا ہے ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کے حوالے سے مضامین کی فہرست تو خاصی طویل ہے لیکن اس موضوع پر منضبط کتابیں چند ایک ہی ہیں، ان میں علی جواد زیدی کی تاریخ ادب کی تدوین ڈاکٹر عامر سہیل اور نسیم عباس احمر کی ادبی تاریخ نویسی ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیق کا فن اہم ہیں ان کتب میں ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط سے متعلق پیش رفت ہوتی نظر آتی ہے۔

تاریخ ادب کی تدوین از علی جواد زیدی: علی جواد زیدی کی تاریخ ادب کی تدوین کی اگر بات کی جائے تو یہ ایک مختصر مگر اردو ادب کی تاریخ نویسی کے حوالے سے اہم کتاب ہے اس کتاب کی پہلی اشاعت علمی مجلس دلی کے زیر اہتمام ہوئی اور دوسری اشاعت ۱۹۸۳ء میں نصرت پبلشرز کے زیر اہتمام امین آباد لکھنو سے ہوئی، اس کتاب کے عنوانات میں، تاریخ ادب کی تدوین، ابتداء کی تاریخ، دور ہندی، تذکرے، دور تاریخ، نئے سکول، اصناف ادب، مختصر تاریخیں، بسیط تاریخیں، اور غیر مطبوعہ مواد وغیرہ شامل ہیں، اس کتاب کی وجہ تصنیف کے حوالے سے مصنف کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> اس کتاب کی شان نزول یہ ہے کہ میں اپنے دوستوں سے اکثر اپنے ادبی مورخوں اور ناقدوں کی اس فروگزاشت کا ذکر کیا کرتا تھا کہ انہوں نے تاریخ ادب کو سراسر تاریخ شعر بنا دیا ہے، شعر میں بھی غزل پر زور ہے دور بندی بھی انہی کی بنیاد پر ہوتی ہے سکول بھی اسی بنیاد پر قائم کیے جاتے ہیں اور عصری رجحانات کا فیصلہ انہیں پر کر دیا جاتا ہے، مجی عبدالطیف اعظمی صاحب سے اس موضوع پر کئی بار گفتگو آئی تو انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی کی ادبی انجمن میں اس کا ذکر کروں، گفتگو کروں۔ کچھ دنوں کاہلی فرمائش میں مانع رہی لیکن آخر کار اعظمی صاحب کے مسلسل اسرار کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہی بنی اس گفتگو کے لیے میں نے کچھ رف نوٹس بنائے تھے انھیں کی بنیاد پر اس جلسے میں گفتگو ہوئی، جلسے کی صدارت جناب ''رام مالک'' نے کی، اس جلسے کے اختتام

پرانہوں نے کہا کہ ان خیالات کو ایک مستقل مضمون کی شکل میں آ جانا چاہیے، میں صدر محترم کے خلوص کے آگے سپر انداختہ ہو گیا، رام مالک نے دوبارہ تحریک کی کہ اس میں مناسب اضافے کر کے ایک کتابچے کی شکل دے دی جائے، اس کی اشاعت کی ذمہ داری انہوں نے خود لے لی۔(۱۱)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف اردو ادب کے تاریخ نویسوں کے روایتی چلن سے خائف ہیں اور وہ ادبی تاریخ نویسی کے عمل میں جدت اور بہتری کے خواہاں ہیں، علی جواد زیدی اب یک لکھی گئی اردو کی ادبی تاریخوں کو سرے سے تاریخ ہی نہیں مانتے ان کے خیال میں ادبی تاریخ نویسی کے لیے لازم ہے کہ پہلے تاریخ ادب کے نظریے کو سمجھا جائے اس ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ تاریخ کو صرف زمانے کی ترتیب کے ساتھ واقعات کو جمع کرنے تک محدود نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان واقعات کے باہمی ربط کو سمجھ کر انہیں ایک لڑی میں اس طرح پرویا جائے کہ ادبی تاریخ کے آغاز وارتقاء کے عمل کی نشاندہی ہو سکے۔

مصنف کا یہ اعتراض کسی حد تک درست ہے کہ اردو ادب کی ابتدائی تواریخ میں شعر وشاعری کو ہی ادب کا پیمانہ تصور کیا جاتا رہا اور نثر کی بابت بہت کم توجہ کی گئی اکثر تواریخ میں تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا، ان کی یہ بات بھی بجا ہے کہ ان تواریخ میں کہیں علاقائی و مذہبی تعصب سے کام لیا گیا تو کہیں پر شاعری کے علاوہ دیگر اصناف ادب کی طرف بہت کم توجہ کی گئی، اور کہیں پر مورخ کا رویہ تاریخی ہونے کے بجائے تنقیدی رو میں بہتا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ کہنا اردو ادب کی کوئی تاریخ سرے سے لکھی ہی نہیں گئی نامناسب بات ہوگی، مصنف کو اس حوالے سے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے تھی کہ انسانی تہذیب وتمدن اس کی فکر، علمی و ادبی رجحانات، اور اس کا معاشرتی طرز عمل ازل سے تعمیری عمل میں گرفتار ہے اور ابد تک رہے گا انسان کے علم وہنر کی کسی بھی کوشش کو آخری حد نہیں قرار دیا جا سکتا ارتقاء کا عمل ہمیشہ جاری وساری رہے گا، تذکروں میں شعر و شاعری کو ہی ادب کا پیمانہ بنایا گیا اور نثر کی طرف توجہ نہیں کی گئی، یہاں پر یہ بات ہمیں ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ دور اردو کی ادبی تاریخ نویسی کا ابتدائی دور تھا اس کو ہم ادبی تاریخ نویسی کا نقطہء آغاز کہہ سکتے ہیں، اب اگر ہم رائٹ برادران سے یہ گلہ کرنے لگ پڑیں کہ انہوں نے ایک سادہ سا جہاز کیوں بنایا، ائربس یا فائٹر جہاز کیوں نہیں بنایا اور اس بات کو جواز بنا کر یہ کہیں کہ جو انہوں نے بنایا تھا ہم اسے جہاز ہی نہیں مانتے تو ہی بات انتہائی

مضحکہ خیز ہو گی، ہم دیکھ سکتے ہیں کہ تذکرہ نویسی کے دور کے اختتام تک آتے آتے تقریباً اردو کی تمام ادبی اصناف کو زیر بحث لایا جا چکا تھا، پھر تاریخ نویسی کے با قاعدہ آغاز کے ساتھ ہی ان اصناف کو ایک ہی کتاب میں یکجا کرنے کا عمل شروع ہوا، اور پھر ان اصناف کے حوالے سے اب تک بتدریج بہتر طور پر تحقیق کا کام جاری ہے۔

میر کا تذکرہ نکات الشعراء بھی اردو کی ادبی تاریخ کی کتاب تھی اور جمیل جالبی اور تبسم کاشمیری کی ادبی تواریخ بھی اردو کی ادبی تواریخ ہیں، ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ میر کا تذکرہ اردو کی ادبی تاریخ کی ابتدائی شکل تھی اور جالبی اور کاشمیری کی کتابیں اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں، اگر ہم یہ کہیں کہ فلاں مصنف کی کتاب ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے مستند اور مکمل کتاب ہے تو ایسا کبھی ممکن نہیں ہے ہر کتاب میں کسی نہ کسی حوالے سے کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے جس پر آنے والے وقتوں میں کام ہوتا ہے، کچھ نئے مضامین تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں جن پر نئے سرے سے تحقیق و تنقید کا آغاز ہوتا ہے، کہیں پر کچھ قدیم ماخذات دریافت کیے جاتے ہیں جن کی جانچ پڑتال سے تاریخ کوئی نیا موڑ لیتی ہے، غرض یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک انسان اس کائنات میں جی رہا ہے، انسان کے علم و فن کی داستان تا ابد ارتقائی عمل میں گرفتار رہے گی۔ رہی بات ادبی تاریخ نویسی کو سائنسی اصولوں پر استوار کرنے کی تو یہ عمل بھی جاری ہے ہر مؤرخ تاریخی عمل میں بہتری اور جدت لانے کی کوشش کرتا ہے۔

علی جواد زیدی ایک طرف تو اپنی کتاب ''تاریخ ادب کی تدوین'' میں اردو کی ادبی تاریخوں کا انکار کرتے ہوئے اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادب اردو اور رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کو بھی تذکروں کی فہرست میں شامل کر لیتے ہیں اور دوسری طرف گل رعنا، شعر الہند اور آب حیات، پر تذکرہ نویسی کی روایت کا خاتمہ بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہی نہیں بلکہ پوری کتاب میں تذکروں اور اردو کی ادبی تواریخ کی اہمیت و افادیت کا ذکر کرتے رہتے ہیں، مصنف تذکروں اور تواریخ پر تمام تر اختلافی مباحث کے باوجود ادبی تاریخ نویسی کا کوئی واضح تصور پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں انہوں نے ادبی تاریخ نویسی کے چند عامیانہ نکات جیسے غیر متعصّبانہ رویہ، قدیم ماخذات کی چھان پھٹک، تشکیک، اور تعین زمانہ وغیرہ کا ذکر کر کے فرض پورا کرنے کی کوشش کی ہے، جواد علی زیدی نے اپنے اسی زعم کے ماتحت ۱۹۹۳ء میں ساہتہ اکادمی کے ایما پر ایک ادبی تاریخ

لکھ ڈالی ، افسوس کا امر یہ ہے کہ وہ اپنے اصولوں کا اطلاق اپنی کتاب پر ہی نہ کر سکے، اس کتاب کی تاریخیت پر رام بابو سکسینہ سمیت کئی محققین ادب نے شدید تنقید کی ہے، اس کتاب کے علاوہ بھی چند ایسی کتب قابل ذکر ہیں جن میں اردو کے ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے، ان میں مسعود سعد غنی کا ایم فل کا مقالہ جو بعد میں کتابی شکل میں اسی موضوع پر کتابی شکل میں منظر عام پر آیا، اور سلمان احمد کی تصنیف ''اردو کی ادبی یاریخیں :نظری مباحث'' اس کے علاوہ ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیق کا فن' اور ڈاکٹر سید عامر سہیل اور نسیم احمر عباس کی مرتبہ کتاب ادبی تاریخ نویسی اہمیت کی حامل کتابیں ہیں ۔ان تمام کتب میں کچھ نہ کچھ مواد ایسا مل جاتا ہے جس سے ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کی تھوڑی بہت گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں۔

تحقیق کا فن از ڈاکٹر گیان چند جین: اردو کی ادبی تحقیق کے حوالے سے یہ ایک اہم کتاب ہے جس میں مصنف نے ادب کے جدید تحقیقی اصول وضوابط پر تفصیلی بحث کی ہے، یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی ، پاکستان میں سنگ میل پبلی کیشنز ، لاہور نے اسے شائع کیا، مصنف نے اس کتاب کے آخر میں اردو اور انگریزی کی ادبی اصطلاحات کی ایک فہرست بھی فراہم کی گئی ہے، کتاب کا بارہواں باب اردو کی ادبی تاریخ نویسی کے جدید علمی رجحانات اور اصول وضوابط پر مشتمل ہے جس میں مصنف نے مغربی محققین ادب کے نظریات کی روشنی میں ادبی تاریخ نویسی کے طریقہء کار کی وضاحت کی ہے۔ادبی تاریخ نویسی پر مشتمل ان کا مضمون ان کی کتاب ''اردو ادب کی تاریخیں'' میں بھی تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ شامل ہے۔

ادبی تاریخ نویسی ، مرتبہ، ڈاکٹر عامر سہیل، نسیم عباس احمر: اس کتاب کو مرتبین نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصے میں چوبیس محققین کے مضامین ادبی تاریخ نویسی کے مسائل اور اصول وضوبط کے حوالے سے درج ہیں ، ان میں سے بیشتر مضامین سرگودہ یونیورسٹی میں ۲۰۰۷ء میں منقد کی گئی ایک سیمینار کی یادگار ہیں جس کا موضوع تاریخ ادب کی تدریس اور ادبی تاریخ نویسی تھا۔اس کے علاوہ بھی کچھ مضامین اس موضوع کے حوالے سے اس کتاب میں شامل ہیں ، دوسرے حصے کو' اردو کی اہم ادبی تاریخیں'' کا نام دیا گیا ہے اس حصے میں رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو ، ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اردو ادب کی تاریخ کے حوالے سے پانچ محققین کے مضامین شامل کیے گئے ہیں، تیسرے حصے میں اردو کی ادبی تواریخ : ایک سرسری جائزہ کے عنوان سے بارہ ادبی تواریخ کے دیباچوں سے

ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے مورخین کے تصورات پیش کیے گئے ہیں، ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کے حوالے سے مجموعی طور پر یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔

د۔ مختلف ادبی تاریخ نویسوں کے تصورات

ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے مورخین نے متفرق مضامین اور ادبی تاریخ کی کتب میں جو نظریات و تصورات پیش کیے ہیں ان سے ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط وضع کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے کیونکہ ان تصورات میں ادبی تاریخ نویسی اور اس کے لوازمات کے بارے میں ایسے نکات مل جاتے ہیں جن پر جدید ادبی تاریخ نویسی کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے، مورخین کے ان تصورات میں بعض مقامات پر اختلاف بھی نظر آتا ہے لیکن اس اختلاف کا ایک اچھا پہلو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ادبی تاریخ نویسی کے ضمن میں نت نئے نظریات وتصورات سامنے آتے رہتے ہیں، بعض مورخین صرف تحقیق کو ہی تاریخ نویسی کی اصل مانتے ہیں اور بعض تنقید کو ادبی تاریخ نویسی کی بنیاد قرار دیتے ہیں جبکہ بعض مورخین ادب تحقیق اور تنقید کے توازن کو ادبی تاریخ نویسی کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں، مورخین ادب اس بات پر متفق ہیں کہ فرد، معاشرہ، زمان ومکاں، آفات، جنگیں، سیاسی منظر نامہ اور انسانی زندگی کے دیگر پہلوؤں کی درست تحقیق وتنقید سے ہی ادبی تاریخ نویسی کا حق ادا ہوسکتا ہے یہاں پر اردو ادب کے نامور مورخین کی کتب سے ادبی تاریخ نویسی کے بارے میں پیش کیے جانے والے تصورات اقتباسات کی صورت میں درج کیے جاتے ہیں۔

محمد حسین آزاد:۔ محمد حسین آزاد اپنی کتاب آب حیات کے دیباچے میں قدیم تذکروں کی روش پر نئی نسل کے اعتراضات کے جواب میں اپنا تصور تاریخ ادب یوں پیش کرتے ہیں:

> نئے تعلیم یافتہ جن کے دماغوں میں انگریزی لالٹینوں کی روشنی پہنچتی ہے وہ ہمارے تذکروں کے اس نقص پر حرف رکھتے ہیں کہ ان سے نہ کسی شاعر کی زندگی کی سرگزشت کا حال معلوم ہوتا ہے نہ اس کی طبیعت اور عادات واطوار کا حال کھلتا ہے نہ اس کے کلام کی خوبی اور صحت وسقم کی کیفیت کھلتی ہے نہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی انتہا یہ ہے کہ سال ولادت اور سال وفات

تک بھی نہیں نہیں کھلتا۔۔۔ان خیالات مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیات جاوداں حاصل ہو۔ (۱۲)

محمد حسین آزاد کے اس اقتباس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ تذکروں کے نقائص کے بارے میں جدید سائنسی تعلیم یافتہ طبقے کے اعتراضات وتحفظات کو خوش دلی سے قبول کرتے ہیں اور ان نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، محدود دستیاب وسائل اور تحقیقی مواد کے ساتھ انہوں نے ابتدائی کوشش کے طور پر آب حیات میں ان مسائل پر خاصی توجہ دی اور شعراء کے حالات زندگی اور ان کے فن کے بارے میں قیمتی معلومات اکھٹی کیں، نقائص اور کوتاہیوں کے باوجود اس کتاب کی اہمیت مسلمہ ہے۔

رام بابو سکسینہ:"History Of Urdu Literature" رام بابو سکسینہ کی کتاب ہے جو انہوں نے انگریزی زبان میں لکھی اور اس کا ترجمہ تاریخ ادب اردو کے نام سے مرزا محمد عسکری نے کیا، اس کتاب کو اردو ادب کے اکثر وبیشتر محققین اردو ادب کی پہلی باقاعدہ تاریخ مانتے ہیں۔

اس کتاب کے ابتدائیے میں مترجم مرزا محمد عسکری مصنف کے تصور تاریخ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

ہسٹری آف اردو لٹریچر'' جناب رام بابو سکسینہ کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے جو انہوں نے انگریزی میں تصنیف فرمائی ہے اور اس سے زیادہ تر غرض تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس سے مستفید ہو مگر اول سے آخر تک اس کتاب کے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مصنف موصوف نے جس کاوش، جس کوشش، زور مطالعہ اور وسعت نظر سے اس میں کام کیا ہے ۔اسلوب بیان وغیرہ میں جو صفائی مدنظر رکھی ہے۔شعراء اور نثاروں کے کلام کا توازن کر کے ان پر جیسی صحیح، بے باکانہ اور بے لاگ رائیں قائم کی ہیں وہ اس کتاب کو ہر حیثیت سے منفرد صورت میں پیش کرتی ہے تلاش وتجسس کا یہ عالم ہے کہ ان واقعات کو اظہر من الشمس کر دیا ہے جن سے ابھی تک لوگ نا آشنا تھے، ایک ایک لفظ سے ضخیم دفتر کا فائدہ اٹھایا ہے۔۔۔فاضل مصنف نے اس کتاب کی ترتیب میں اسی روش کا خیال رکھا

ہے جو انگریزی کے مشہور مورخین ، سینٹس بری اور گاس وغیرہ نے اپنی تصانیف میں اختیار کی ہے، جس کے علاوہ جدت ،ترتیب اور مخصوص اسلوب بیان کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ کتاب ان اشخاص کے واسطے بہت مفید ہو گی جنہوں نے ، بی۔اے، ایم ۔اے، کی ڈگری یا آئی سی ایس کے واسطے اردو ادب لیا ہو۔(۱۳)

کتاب کی تمہید میں رام بابو سکسینہ اپنے تصور تاریخ کی تشریح یوں کرتے ہیں:

اس کتاب کی تصنیف کی اصل غرض یہ ہے کہ ادب اردو کی تدریجی ترقی کا خاکہ زمانہ قدیم سے لے کر زمانہ حال تک کا معہ مشہور شعراء اور نثاروں کے مختصر حالات زندگی اور ان کے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید کے کھینچا جائے یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ایک طبقہ کے تعلقات دوسرے طبقہ کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات دوسرے فرد کے ساتھ اس میں وضاحت سے بیان کیے جائیں نیز مختلف تحریکوں اور طرزوں کی ابتداء اور ترقی اور زوال کے اسباب بتائے جائیں ۔ اور اس دور کے تاریخی حالات و واقعات بھی نظر انداز نہ کیے جائیں ، جن میں کہ وہ شعراء اور نثار گزرے یہ کتاب محض کسی زمانے کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں بلکہ ان خیالات اور خصوصیات کے دکھانے کی اس میں پوری کوشش کی گئی ہے جن کا اثر اس زمانہ پر تھا۔ اس کتاب کی تصنیف میں میرے پیش نظر یہ رہا کہ یہ زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں کے مطابق بطور ٹیکسٹ بک تیار کی جائے تا کہ انگریزی دان جماعت بھی ادب اردو سے کما حقہ واقف ہو جائے ۔(۱۴)

ان اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ رام بابو سکسینہ کا انگریزی علم و ادب کا مطالعہ بھی کافی وسیع تھا ، نقد ادب اور ادبی تاریخ نویسی کے معاملے میں انہوں نے انگریز مورخین کی پیروی کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی روایت سائنسی طرز تحقیق کی طرف مائل ہوئی ،اس انداز تحقیق نے آنے والے مورخین کے لیے جدید ادبی تاریخ نویسی کی راہیں مستحکم کیں، چونکہ انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی ضروریات کو مدنظر رکھا اور تاریخی ماخذات کی زیادہ تفصیلات پیش کرنے سے کسی حد تک گریز کیا اس وجہ سے اس کتاب میں تاریخیت کا عنصر کہیں کہیں ادھورے پن کا شکار رہا۔

حامد حسن قادری: حامد حسن قادری کا شمار اردو ادب کے معتبر مورخین میں ہوتا ہے ان کی کتاب داستان تاریخ اردو اردو ادب کی تواریخ میں ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۱ء میں آگرہ سے شائع ہوئی، اس کتاب میں مصنف نے اردو ادب کے نثر نگاروں کے حالات زندگی اور ان کے فن کا احاطہ کیا ہے ادبی تاریخ نویسی میں وہ بے باک تنقید کو بہت اہمیت دیتے ہیں انہوں نے اس کتاب میں خاصی تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے، شاعروں کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے یہ کتاب ادھورے پن کا شکار ہوگئی ہے۔ حامد حسن قادری اپنے تاریخی تصور کی وضاحت کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

> بے لاگ اور بے باک تنقید کرنا نہ صرف تصنیف بلکہ ذات مصنف پر بھی (مصنف کی حیثیت سے) اب تک پل صراط پر گزرنے سے کم نہیں ہے لیکن میں نے اس کی جسارت کی ہے۔۔۔ اردو تصانیف میں اب تک جو کمی نظر آتی ہے وہ صحیح تنقید و تدقیق کی ہے۔ کوئی مضمون و موضوع ہو، زبان و ادب ہو، تاریخ، سیرت، شاعری یا اور کچھ اس کے لکھنے کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ہر پہلو پر غور نہ کیا جائے اور ہر ممکن ذریعہ سے ایک ایک جزو، ایک ایک رخ کی تنقید نہ کی جائے (۱۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی: ڈاکٹر جمیل جالبی اردو زبان و ادب کے نامور محقق، نقاد اور مورخ ہیں ان کی اہم تصانیف میں، معاصرانہ ادب، تنقید اور تجزیہ، ارسطو سے ایلیٹ تک، ایلیٹ کے مضامین، قدیم اردو کی لغت، پاکستانی کلچر، نئی تنقید، ن ۔ م راشد ایک مطالعہ، اور تاریخ ادبِ اردو اہم ہیں، ان کی کتاب تاریخ ادب اردو کو ادبی تاریخ کی کتب میں نمایاں مقام حاصل ہے یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے اور مجلس ترقی ادب لاہور سے اس کی اشاعت ہوئی، تاریخی تحقیق و تنقید کے حوالے سے یہ کتاب ایک اہم ماخذ کی صورت اختیار کر گئی ہے، چار جلدوں پر مشتمل یہ کتاب ڈاکٹر جمیل جالبی کی محنت جانفشانی اور ہمت و حوصلے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تاریخ ادب اردو کی پہلی جلد کے پیش لفظ میں جالبی اپنا نظریہ تاریخ ادب کچھ یوں پیش کرتے ہیں۔

> اب تک جتنی بھی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں مختلف علاقوں کا قدیم اردو ادب الگ الگ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا یہ سب الگ الگ جزیرے ہیں جن کے ادب و زبان کے

مطالعے کا مجموعی نام تاریخ ادب رکھ دیا گیا ہے، میرے لیے یہ بات قابل قبول نہ تھی کہ گجرات، دکن اور شمال کا ادب الگ الگ جزیروں کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک کا تعلق دوسرے سے کچھ نہیں ہے۔ جب میں نے قدیم ادب کا براہ راست مطالعہ کیا تو اثرات و روایات کا ایک ایسا سلسلہ نظر آیا جو ایک دوسرے سے پوری طرح پیوست تھا، یہ تحقیق کی ایک نئی صورت تھی۔۔۔۔تاریخ ادب کا کام یہ ہے کہ وہ بتائے کہ اس ادب میں کیا کیا ہوا اور کیوں ہوا، وہ ادب کن کن راستوں سے گزر کر آج کے راستے پر آیا، تخلیقی و فکری سطح پر اس نے اپنے زمانے کو کیا دیا، اپنے زمانے کی روح کو کس طرح اور کیسے لفظوں میں سمویا، زبان و ادب کو کیا دیا، اس دور کی روح کیا تھی جو تخلیق ادب کا باعث بنی، کس طرح ادب نے اپنے دور کو روحانی کیف اور ذہنی و جمالیاتی لطف فراہم کیا، اس میں آفاقی عنصر کی نوعیت کیا ہے۔ تاریخ ادب کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ بتائے کہ اس میں کیا نہیں ہے بلکہ یہ بتائے کہ فی الواقع اس میں کیا ہے۔(۱۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں ادب کو زندگی کا آئینہ ہونا چاہئے یعنی ادب زندگی کی تصویر بلکل اسی طرح پیش کرے جس طرح تصویر ہوتی ہے، ادب کی تاریخ میں کلچر، فکر اور تاریخ کا تخلیقی امتزاج ہونا لازم ہے، ان کے خیال میں ادبی تاریخ کے لیے تحقیق، تنقید اور کلچر کا باہم مل کر آگے بڑھنا ضروری ہے، ان تمام خصوصیات کا حامل مورخ صحت مند حقائق، صحیح نتائج اور زندگی کے تنوع پر مشتمل ادب کی تفہیم کر سکتا ہے، وہ مورخ کے لیے رنگین شاعرانہ اسلوب کو درست نہیں سمجھتے کیونکہ اس سے اصل تاریخ کی صورت بگڑ سکتی ہے، جمیل جالبی تاریخ ادب میں واقعات و حقائق کے اندراج کے ساتھ ساتھ مختلف زمانوں اور علاقوں کے ادب کے باہمی روابط کو بھی اہم قرار دیتے ہیں کہ اس سے ادبی تاریخ کی صورت منظم طور پر قاری کے سامنے آ جاتی ہے ہر دور کے انفرادی ادبی معیارات کے ساتھ ساتھ وہ ادب کے دائمی اصولوں کو بھی ماضی اور حال کے رشتے کی وضاحت کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں اور تاریخی شعور، قوت تجزیہ، نتائج اخذ کرنے کی اہلیت، تنقیدی نقطہ نظر، تحقیقی مزاج اور لسانی شعور جیسے عوامل کو مورخ کے لیے بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا نظریہ تاریخ بہت واضح اور سیدھا ہے، وہ ادبی منظر نامے میں سماجی اتار چڑھاو اور

زبان وبیان کی تبدیلیوں کے بارے میں مستند تحقیقی رائے رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخ ادب اردو کی ادبی تواریخ میں سب سے زیادہ مستند کتاب تصور کی جاتی ہے، اس کتاب میں جالبی نے حتی الامکان اصل ماخذات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں وہ ادب اردو کے بعض ایسے گوشوں تک بھی جا پہنچے ہیں جن تک کوئی دوسرا مؤرخ نہیں پہنچ سکا تھا، اپنی اس تصنیف میں جالبی نے تحقیق وتنقید اور تاریخیت کے عناصر کو متوازن رکھا ہے نہ تو بلکل ہی تحقیقی رویہ اپنایا ہے اور نہ ہی صرف تنقید پر اکتفا کیا ہے۔اردو زبان وادب پر ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے ادب کے اثرات کے حوالے سے ان کی تحقیق قابل ستائش ہے، تحقیقی نتائج کو جالبی نے ہر ممکن دلائل اور اسناد سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری: ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کے بعد تبسم کاشمیری نہایت محنت اور جانفشانی سے ایک اور مستند ادبی تاریخ اردو ادب کے ذخیرے میں شامل کر دی ہے، ان کا ادبی تاریخ نویسی کا تصور فرانس کے مکتبہ فکر، اینلس، "Annales School" کے عمومی تصور سے مماثلت رکھتا ہے، انہوں نے اردو کی ادبی تاریخ کو کلاسیکی تصور سے آزاد کر کے عملی معنویت عطا کرنے کی کوشش کی ہے، اپنے تاریخی تصور کے ذریعے وہ ادبی مورخ کو تاریخ کے ساتھ ساتھ سماجی علوم کی واقفیت دلانے کی کوشش کرتے ہیں وہ تخلیقی شخصیات میں انفرادی خصوصیات پیدا کرنے والے داخلی محرکات اور نفسیاتی میلانات کے مطالعے کو مورخ کے لیے لازم قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ صرف وہی مورخ ادبی تاریخ نویسی کا حق ادا کر سکتا ہے جو زبان وادب سے وابستہ دیگر تمام علوم پر بھی حاوی ہو یا کم از کم ادبی تاریخ کے لیے ان علوم میں موجود لوازمات کی آگاہی رکھتا ہو، ان کا ماننا ہے کہ ادبی مورخ کو کسی خاص دور کے تجزیے کے دوران صرف ادب کے شعبے تک محدود نہیں رہنا چاہئے بلکہ اس دور کے سماجی علوم، اقتصادیات، دیو مالا، سیاسی واقعات، تہذیبی وثقافتی عوامل، فلسفہ اور نفسیات وغیرہ کی ذیل میں اس دور کے ادب اور اس کی ترقی یا زوال کا جائزہ پیش کرنا چاہئے تا کہ قاری پر ادبی عروج وزوال کے حقیقی اسباب واضح ہو سکیں اور انسانی معاشرے کے ادب پر مرتب ہونے والے منفی اور مثبت اثرات کا علم ہو سکے، ان کے خیال میں کلاسیکی ادبی تصور میں علاقائی، لسانی، مذہبی اور علمی سطح پر محدود حد بندیاں قائم کی گئی ہیں جن کی وجہ سے ادب قدیم کی اصل شکل مسخ ہو گئی ہے یا پھر انتہائی مبہم انداز میں ہمارے سامنے آتی ہے اس میں حقائق کا کھوج لگانا بہت مشکل کام ہے۔

اپنی کتاب اردو ادب کی تاریخ لکھتے ہوئے تبسم کاشمیری نے ۳۵۸ اردو اور ۸۴ انگریزی کتب سے استفادہ کیا، ان میں سے کئی کتب نئے ماخذات میں شامل ہیں، اس کے علاوہ انہوں نے براہ راست کئی قدیم ماخذات تک رسائی حاصل کی ہے اور حتی الامکان نقل در نقل کی روایت سے گریز کرنے کی کوشش کی ہے، اصل متون کو تلاش کر کے ان سے اہم نمونے منتخب کیے ہیں، اس کتاب کی حیثیت معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ، تجزیاتی، تحقیقی اور تنقیدی بھی ہے جس سے ادبی تاریخ نویسی کے فن میں توازن پیدا ہوتا نظر آتا ہے۔ تبسم کاشمیری نے مستند تحقیق اور اس کی تشریح و توضیح کے اصولوں کی روشنی میں اس کتاب کی بنیادیں استوار کی ہیں اس کتاب میں ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے وہ اپنا نقطہ نظر یوں بیان کرتے ہیں۔

> ادبی مورخ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ادبی تاریخ کے ارتقائی عمل میں ماضی کے ادبی ذخائر کا جائزہ لیتا ہے مگر اس کا کام صرف جائزہ لینے کی حد تک محدود نہیں ہے اس کا بنیادی کام ادبی ذخائر کی قدر و قیمت کا تعین کرنا ہے۔۔۔ادبی مورخ کا ایک کام یہ بھی ہے کہ جب تاریخ کا جلوس اپنی ایک منزل پوری کر لے تو وہ اس بات کا جائزہ لے کہ اس طویل یا مختصر سفر کے ثمرات و حاصلات کیا ہیں؟ روایت کس حد تک آگے بڑھی ہے؟ اس سفر میں کون سی تبدیلیاں ممکن ہو سکی ہیں؟، کیا ان تبدیلیوں کی بناء پر ہم اس سفر کو کسی خاص نام سے منسوب کر سکتے ہیں؟۔(۱۷)

ڈاکٹر وہاب اشرفی: تاریخ ادبیات عالم جیسی کتاب اردو ادب کے کوٹے میں شامل کرنے والے مورخ وہاب اشرفی کا شمار ایسے محققین ادب میں ہوتا ہے جن کو حقیقی معنوں میں ادب کا تاریخی شعور ہے، ان کی تاریخ ادب اردو بھی ادبی تاریخ نویسی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، اس کتاب میں انہوں نے اردو ادب کی تاریخ کا احاطہ خالص تحقیقی و تنقیدی انداز میں کیا ہے، وہ مبہم بیانات، سنین و واقعات کی غلطیوں، دانستہ فریب کاریوں، بیانات کے تضادات، بے جا طوالت اور جدید رجحانات و تحریکات سے بے خبری کو تاریخ ادب کے لیے سم قاتل قرار دیتے ہیں، ان کے خیال میں اردو ادب کے اکثر مورخین تخلیق اور تخلیق کار کے مقام و مرتبے سے صرف نظر کرتے ہوئے علاقائی، مذہبی اور لسانی تعصّبات سے کام لیتے ہیں، اس حوالے سے وہ مغربی مورخین کے رویے کی تعریف کرتے ہیں، وہاب اشرفی دبستانوں کی تفہیم کو زیادہ اہمیت دینے کے حق میں نہیں ہیں، فنکار

کو کسی دبستان سے وابستہ کر کے اس کا ذکر کرنے کو وہ لازم نہیں سمجھتے۔

اس حوالے سے وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

> مجھے دبستانوں سے چڑ نہیں ہے لیکن کوئی ضروری نہیں کہ کسی فنکار کو کسی اسکول سے وابستہ کر کے ہی گفتگو کی جائے۔ دراصل وقت، حالات، کوائف، سانحات، اور لین دین سے جامد تصورات پارہ پارہ ہو جاتے ہیں، کوئی ضروری نہیں کہ لکھنؤ کا ہر شاعر عیش وعشرت کے ہی پیمانے اپنی شاعری میں استعمال کرتا رہے۔ دراصل رجحانات و میلانات اپنے خصائص کی وجہ سے ایک اسکول یا نظریے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں لیکن ان کے خدوخال کو اٹل سمجھنا کسی فنکار کی انفرادیت کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ اجتماعی نقطہ نظر سے کچھ باتیں کیں جا سکتی ہیں لیکن بیحد تحفظات کے ساتھ، ورنہ فنکاروں کی الگ الگ شکلوں کی شناخت کا سوال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ میں نے اپنے طور پر ان دبستانوں کا سرسری ذکر کیا ہے، لیکن ان میں اسیر نہیں رہا۔ (۱۸)

ڈاکٹر سلیم اختر: ڈاکٹر سلیم اختر اردو زبان وادب کے معروف محقق، مورخ، نقاد، اور افسانہ نگار ہیں ان کی کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ قارئین میں بے حد مقبول ہے، اس کے علاوہ وہ تنقیدی دبستان اور اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ جیسی اہم کتب کے مصنف ہیں، اردو ادب میں نفسیاتی تنقید ان کا خاص حوالہ ہے، ڈاکٹر سلیم اختر تاریخ کو محض ایام شماری اور معلومات و کوائف کا اندراج نہیں سمجھتے ان کے خیال میں ادبی مورخ کو ان امور کے ساتھ ساتھ ان تمام سیاسی، سماجی، تہذیبی و تمدنی، نفسیاتی اور روحانی عوامل کا بھی تجزیہ کرنا چاہئے جو تخلیق اور تخلیق کار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ رائے کی تشکیل میں ادبی مورخ کی ذاتی پسند و ناپسند، ترجیحات اور تعصّبات وغیرہ کو ڈاکٹر سلیم اختر ادبی مورخ کی انفرادی نفسیات کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ اپنی کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں ادبی تاریخ نویسی کا تصور کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

> کسی زبان کی جغرافیائی حدود سے مخصوص لسانی، روحانی، تہذیبی، تمدنی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی عوامل ومحرکات کے عمل اور ردعمل سے تشکیل پانے والے ذہنی تناظر میں وقوع

پذیر ہونے والی تخلیقات کی معیار بندی، لسانی مضمرات اور تخلیقی شخصیات کا مطالعہ تاریخ نگاری اور ان ہی کا مطالعہ، تجزیہ و تحلیل اور تشریح ادبی مورخ کا بنیادی فریضہ۔(۱۹)

ڈاکٹر گیان چند جین: ڈاکٹر گیان چند جین کا شمار اردو زبان و ادب کے ممتاز محققین میں ہوتا ہے، ان کی نمایاں تصانیف میں ،ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب، اردو ادب کی تاریخیں ، تحقیق کا فن، عام لسانیات، اردو مثنوی شمالی ہند میں ،لسانی مطالعے، پرکھ پہچان، اور کھوج وغیرہ شامل ہیں، اپنی کتاب تحقیق کا فن میں اردو کی ادبی تاریخ نویسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ادبی تاریخ ایک طرف تاریخ ہے ، دوسری طرف ادب۔ یہ سوانح نگاری اور تنقید کے امتزاج سے بنی ہے لیکن اسے تحریک ملی سیاسی تاریخ سے، جس کی مماثلت پر اس نے سوانحات کو ترتیب دیا۔ بعد میں ادبی اصناف کی شعریات کا بھی اضافہ کیا۔ ادبی تاریخ اور سیاسی تاریخ میں ایک بڑا فرق ہے۔ سیاسی تاریخ کے واقعات ماضی کے پردہ عدم میں مکتوم ہیں جب کہ ادبی تاریخ کی ماضی کی تخلیقات ہمارے سامنے موجود ہیں جس کی وجہ سے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ادب میں ماضی و حال کی تقسیم سے انکار کیا تھا۔ ادبی تاریخ رقم کرنے سے پہلے نظریاتی بنیاد متعین کر لینی چاہئے۔(۲۰)

مورخین ادبِ اردو کے تصورات اور ادبی تاریخ نویسی پر مبنی کتب کے مطالعے کی روشنی میں ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کے چند نکات یوں سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ادبی مورخ کے ذہن میں حرکت، ارتقاء، تسلسل اور روایت کا واضح تصور موجود ہو۔

۲۔ ادبی تاریخ نہ تو کلی طور پر تنقیدی ہو اور نہ ہی صرف تحقیق پر مبنی ہو بلکہ اس میں تنقید اور تحقیق کا توازن ہو۔

۳۔ ادبی مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایمانداری، محنت اور غیر جانب داری کے ساتھ ماضی کے مسلمہ واقعات قلمبند کرے۔

۴۔ مورخ سوانحی مواد کی چھان پھٹک اور جمع آوری پر خصوصی توجہ دے۔

۵۔ تاریخ کے ہر دور کا سماجی، تہذیبی، فکری، اور معاشرتی مطالعہ ادبی مورخ کے لیے ضروری ہے۔

۶۔ مورخ کو چاہئے کہ وہ انفرادی تخلیقات کے ساتھ ساتھ اجتماعی تحریکات اور دبستانوں کے کارناموں سے مرتب ہونے والی تاریخ کا بھی احاطہ کرے۔

۷۔ درست ماخذات اور دستاویزات کی تلاش میں مورخ کو حوصلے اور لگن سے کام لینا چاہئے۔

۸۔ ادبی تاریخ نویسی کے لیے مورخ کو معاشروں کے اجتماعی رویوں کی جانچ پڑتال اور ان رویوں کے ادب پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لینا بھی از حد ضروری ہے۔

۹۔ تاریخی واقعات کے جلوس میں سے اہم اور غیر اہم کا درست تعین بھی ایک اہم کام ہے۔

۱۰۔ ادب سے متعلقہ دیگر علوم مثلاً مذہب، سیاست، سماجیات، اور اخلاقیات کا علم بھی مورخ کو ہونا چاہئے۔

۱۱۔ مورخ کو چاہئے کہ وہ ادب پاروں اور ادبی شخصیات کو ان کے اپنے عہد میں رکھ کر پرکھے۔

۱۲۔ ادوار بندی کے معاملے کا صحیح ادراک مورخ کو ہونا چاہئے۔

۱۳۔ سنین کی صحت کے بارے میں تحقیق مستند ہو۔

۱۴۔ ہر صنف ادب کو مناسب مقام دے۔

۱۵۔ لسانی نظریات وضع کرنے کے لیے صوتیات اور صرف ونحو کا سنجیدہ مطالعہ بھی مورخ کے لیے ضروری ہے۔

۱۶۔ تاریخ ادب کے جدید نظریات اور مباحث سے آگاہی ہو۔

۱۷۔ ادبی تاریخ میں تخلیق کاروں کی نگارشات کے نمونے شامل کرنا بھی ادبی تاریخ نویسی کا ایک اہم جز ہے۔

۱۹۔ اسلوب تحریر مناسب اور پر اثر ہو۔

یہ کچھ نکات ایسے ہیں جن پر تقریباً تمام ادبی مورخین متفق ہیں، یہ نکات ان کتب سے لیے گئے ہیں جو اردو ادب کی مستند تواریخ میں شمار ہوتی ہیں یا ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، المیہ تاریخ، تاریخ پبلکیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۴۵

۲۔ ابن خلدون، مقدمہ تاریخ، جلد اول، مترجم مولانہ عبد الرحمٰن، دہلوی، مطبع دارالاشاعت، کراچی، دسمبر ۲۰۰۹ء، ص ۴۷

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۲۰۱۴ء ص ۱۷۲

۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادب اردو، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۶۹

۵۔ محمد حسین آزاد، مولانا، آب حیات، الحمد پبلکیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۔۱۱

۶۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، سنگ میل پبلکیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۹۸

۷۔ ایضاً، ص ۲۱۔۲۲

۸۔ ایضاً، ص ۲۱

۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۲۷

۱۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، سنگ میل پبلکیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۰

۱۱۔ علی جواد زیدی، تاریخ ادب کی تدوین، طبع دوم، نصرت پبلکیشنز، لکھنؤ ۱۹۸۳ء، ص ۵

۱۲۔ محمد حسین آزاد، مولانا آب حیات، الحمد پبلکیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۔۱۱

۱۳۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، التماس مترجم سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۸۔۱۹

۱۴۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، تمہید، سنگ میل پبلیشرز لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۱

۱۵۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو ،تاجر کتب آگرہ،۱۹۴۱ء،ص۲۳

۱۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو،جلداول وسوئم مجلس ترقی ادب،لاہور،۱۹۸۵ء،ص۱۶

۱۷۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،اردو ادب کی تاریخ،سن ندارد،ص۱۱

۱۸۔ وہاب اشرفی،ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو،جلداول،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،دہلی،۲۰۰۷ء،ص۲۱

۱۹۔ سلیم اختر،ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ،تیسواں ایڈیشن،سنگ میل پبلیشرز، لاہور،۲۰۱۳ءص ۱۸

۲۰۔ گیان چندجین،ڈاکٹر، تحقیق کا فن،فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۴ء،ص،۳۱۲

باب دوم

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: مصنف وتصنیف

ا۔ ڈاکٹر سلیم اختر: سوانح، شخصیت وخدمات

ب۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: ایک تعارف

ج۔ مصنف کا تحقیقی وتنقیدی رویہ: ایک تعارف

د۔ اغراض ومقاصد

ح۔ مسائل ومشکلات

ہ۔ تکمیل وطباعت

دوسرا باب

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: مصنف و تصنیف

۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر: سوانح، شخصیت و خدمات

ڈاکٹر سلیم اختر ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ کو فلیمنگ روڈ قلعہ گوجر سنگھ لاہور میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام قاضی عبدالحمید قریشی تھا قاضی عبدالحمید چونکہ نسلاً قریشی تھے اور ان کے خاندان میں قاضی بھی گزرے تھے اس لیے اپنے نام کے ساتھ قریشی اور قاضی لکھتے تھے، ڈاکٹر سلیم اختر کے والد ملٹری اکاؤنٹس سے وابستہ تھے ان کا انتقال لاہور میں ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو ہوا۔ ان کے دادا قاضی عبدالحکیم قریشی بی۔اے بھی اسی شعبے میں ملازم رہے تھے اس ملازمت سے قبل ان کے دادا بعض افغان شہزادوں کے اتالیق اور کچھ عرصہ تک بلوچستان میں پولیٹیکل ایجنٹ بھی رہے ملٹری اکاؤنٹس سے ریٹائر ہو کر سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی اور وہی پر ان کا انتقال ہوا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی والدہ کا نام امام بی بی تھا جو کہ شادی کے بعد رضیہ بیگم کہلائیں فیروز پور کی تحصیل مکستر کے گاؤں رتہ تھیڑا کی رہنے والی تھیں، گھر میں سلیم اختر اور ان کے بہن بھائی اپنی والدہ کو آپا کہہ کر بلاتے تھے، ان کا انتقال ۱۶ اپریل ۱۹۷۶ء کو لاہور میں ہوا، ان کے والد یعنی ڈاکٹر سلیم اختر کے نانا کا نام نور حسن تھا جو کسی سکول میں پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے پانچ بہن بھائی ہیں اور وہ ان میں سب سے بڑے ہیں ان کے بعد ان کے بہن بھائیوں میں نسیم خالدہ، شمیم خالدہ، عابد حمید، اور سب سے چھوٹی بہن روبینہ پیدا ہوئے۔ اب ان کی تینوں بہنیں اپنے گھروں میں آباد ہیں اور بھائی عابد حمید نیو جرسی، امریکہ میں فیزیوتھراپسٹ ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے والد پڑھے لکھے روشن خیال اور نرم خو انسان تھے انہوں نے اپنی اولاد کو ہر طرح کی شخصی اور فکری آزادی دی وہ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے اور ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ان کے تعلقات بھی تھے تاجور نجیب آبادی، اختر شیرانی، ابن انشاء اور عبدالحمید عدم ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور انہی مراسم کا اثر تھا کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے بچپن ہی سے ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ان کی والدہ امام بی بی (جو

کہ شادی کے بعد رضیہ آپا کہلائیں) نے بھی اپنی اولاد کی پرورش خوب اچھے انداز میں کی، ملٹری اکاونٹس کی ملازمت کی وجہ سے قاضی عبدالحمید قریشی کا تبادلہ مختلف علاقوں میں ہوتا رہا۔تقریباً پانچ برس کی عمر میں سلیم اختر کو سٹینڈرڈ سٹی ہائی سکول میں جو کہ میکلوڈ روڈ لاہور میں تھا داخل کرایا گیا، ابتدائی وقتوں میں سلیم اختر ایک کمزور طالب علم ثابت ہوئے لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی تعلیمی استداد میں اضافہ کیا۔ اسی دوران دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور ان کے والد کو مڈل ایسٹ بھیج دیا گیا، سلیم اختر بلوچستان کے ایک قصبے فورٹ سنڈیمن میں اپنی پھوپی کے گھر آ گئے اور ایک سال تک یہاں قیام کیا۔

۱۹۴۱ء میں والد کی واپسی کے بعد وہ پونا آ گئے ، یہاں پر ان کا خاندان پونا چھاؤنی میں واقع بھگوان داس کی چال میں سکونت پذیر ہوئے سلیم اختر کو یہاں ایک پرائمری سکول میں دوسری جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔اسی زمانے میں ان کا تعارف مشہور شاعر عبدالحمید عدم سے ہوا جو کہ ان کے والد کے قریبی دوست تھے اور ان کے ہمسائے میں ان کا مکان تھا یہی پر انہوں نے تیرتھ رام فیروزپوری کے جاسوسی، صادق صدیقی کے تاریخی اور ایم اسلم کے اصلاحی و سماجی ناول پڑھے ، مسدس حالی کا مطالعہ کیا اور سکول کے تقریری مقابلوں میں حصہ لیا۔

۱۹۴۴ء میں سلیم اختر کے والد کا تبادلہ انبالہ چھاونی میں ہوا، انبالہ میں سلیم اختر کو اپنے والد کے ساتھ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں جانے کا موقع ملا اور ابن انشا سے ملاقات ہوئی، ان ادبی محفلوں کے زیر اثر سلیم اختر کو شاعری کا شوق چڑھا اور انہوں نے ''انجان'' تخلص رکھ کر شاعری شروع کر دی اسی زمانے میں عبدالحمید عدم بھی انبالہ آ گئے اور سلیم اختر نے ان سے شاعری میں اصلاح لینی شروع کر دی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکا۔ ۱۹۴۷ء میں جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھ رہے تھے تو انہوں نے ایک کہانی ''ایماندار مصور'' کے نام سے لکھی جو بچوں کے رسالے ''تعلیم و تربیت'' میں شائع ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد سلیم اختر اپنے والدین کے ہمراہ لاہور آ گئے، یہاں پر ان کے والد کی تعیناتی ملٹری اے۔جی آفس راولپنڈی میں ہوئی اور سلیم اختر اپنے کنبے کے ہمراہ محلّہ کرتار پورہ کے قریب ''بنی'' کے علاقے میں قیام پذیر ہوئے یہاں پر ڈاکٹر سلیم اختر کو ایک سکول میں ساتویں جماعت میں داخل کرا دیا گیا چھ ماہ بعد ان کے والد کا تبادلہ راولپنڈی شہر ہو گیا جہاں انہیں مسلم ہائی سکول میں آٹھویں جماعت میں داخلہ

مل گیا دو سال بعد ۱۹۵۱ء میں فیض السلام ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ کالج اصغر مال میں داخلہ لیا اور یہاں سے ۱۹۵۳ء میں ایف۔اے سیکنڈ ڈویژن اور ۱۹۵۵ء میں اور یہی سے بی۔اے تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا راولپنڈی میں سلیم اختر کی ادبی سرگرمیاں تیز ہوگئیں اور ان کا شمار بچوں کے مشہور ادیبوں میں ہونے لگا، ان کی خواہش تھی کہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ فن موسیقی اور فلم ڈائریکشن کی تعلیم حاصل کریں لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی، البتہ کالج کے دنوں میں کچھ ڈراموں میں نسوانی کردار ادا کرنے کا موقع ضرور ملا۔بی۔اے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے فلسفہ اور نفسیات کے مضامین پڑھے اس زمانے میں ان کا شمار کالج کے نمایاں طلبہ میں ہوا کرتا تھا، کالج کی طرف سے انہیں ''بہترین مقالہ نگار'' کا انعام بھی ملا، اسی زمانے میں انہوں نے اناطول فرانس کے مشہور ناول ''تائیس'' کا مطالعہ کیا اور اس سے بہت متاثر ہوئے، کالج کے زمانے میں انہوں نے مقامی اخبارات تعمیر، کوہستان، اور ہفت روزہ ''قندیل کے لیے چھوٹے چھوٹے تنقیدی مضامین بھی لکھے اور کچھ مختصر کہانیاں بھی لکھیں جو محفوظ نہ رہ سکیں، طالب علمی کے زمانے میں سلیم اختر نے ڈپٹی نظیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' اور اکبر الہ آبادی پر دو مضامین لکھے جو ناصر کاظمی کے رسالے ''ہمایوں'' میں شائع ہوئے، اسی زمانے میں کافی عرصہ تک انہوں نے ریڈیو کے لئے پروگرام بھی لکھے۔

بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد سلیم اختر کو گھر کے مالی حالات سدھارنے کے لیے ملازمت کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ پشاور میں مقیم اپنے ایک دوست ظفر اقبال کے ہاں چلے گئے، یہاں انہوں نے کنٹرولر ناردرن ایریا کے دفتر میں کلرک کی نوکری کے لیے ٹیسٹ دیا اور کامیاب ہوکر بہ غرض روزگار پشاور آ گئے، پشاور میں سلیم اختر نے دو سال قیام کیا وہ ان دو سالوں کو اپنی زندگی کا بدترین دور قرار دیتے ہیں اس بابت وہ اپنی آپ بیتی ''نشانِ جگرِ سوختہ'' میں لکھتے ہیں۔

> پشاور میں دو سالہ قیام ایام زیست کے بدترین ایام میں سے ہے۔پریشانی، اضطراب اور بے خواب راتیں، مسلسل اعصابی تناؤ کے نتیجہ میں معدہ کے دائمی عوارض، اپنی حالتِ زار پر رویا اور خودکشی کرتے کرتے رہ گیا یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے کسی Bio-data میں پشاور اور بالخصوص کلرکی کا حوالہ شامل نہ کیا۔یہ بپتا کسی اور سلیم اختر کی تھی، میری نہ تھی سو میں کیوں اس کا ذکر کرتا؟۔(۱)

دو سال بعد انہوں نے کلرکی کی نوکری ترک کرنے کی ٹھان لی اور اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے لگے اس دوران ان کی ملاقات روزنامہ ''شہباز'' کے ایڈیٹر شریف فاروق سے ہوئی، کچھ عرصے تک تجربہ حاصل کرنے کے لیے شام کو روزانہ ان کے دفتر جاتے رہے، جلد ہی انھیں روزنامہ ''شہباز'' میں مستقل ملازمت مل گئی اس اخبار میں سلیم اختر ''زریں تاج'' کے نام سے عورتوں اور بچوں کا صفحہ مرتب کیا کرتے اور انگریزی خبروں کے تراجم بھی کرتے، اس اخبار کی ملازمت کے دوران انہوں نے آڈٹ اینڈ اکاونٹس میں بطور اپر ڈویژن کلرک کی نوکری حاصل کر لی اور لاہور آ گئے یہاں پر انہیں پرانی سینٹرل جیل جو کہ اب ختم کر دی گئی تھی اور اس جگہ کئی سرکاری دفاتر تھے کے ایک سیکشن میں فرائض سونپے گئے، لاہور میں ان کی ملاقات سیف الدین سیف اور قتیل شفائی سے ہوئی، سلیم اختر نے ایک بار پھر موسیقی کی دیرینہ خواہش کی طرف توجہ کی اور موسیقی کی شام کی کلاسز میں داخلہ لے لیا لیکن ایک بار پھر وہ اپنے مقصد کی تکمیل میں ناکام رہے، اسی دوران ان کے گھر والے بھی سیالکوٹ سے لاہور منتقل ہو گئے، ۱۹۵۷ء میں سرٹیفکیٹ ان لائبریری سائنس میں داخلہ لے لیا اور کورس مکمل کرنے کے بعد انہیں پنجاب یونیورسٹی میں اسسٹنٹ لائبریرین کی ملازمت مل گئی اور کچھ عرصہ پنجاب پبلک لائبریری میں بھی خدمات سرانجام دیں، اسی دوران انہوں نے دوستوفسکی کا بغور مطالعہ کیا، یہاں ان کی ملاقات مرزا ادیب اور یونس جاوید سے ہوئی اور ٹی ہاوس اور حلقہ ارباب ذوق کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے، اسی زمانے میں سلیم اختر مشہور پبلیشر عبدالغفور کے مکتبہ ناشرین سے بھی وابستہ رہے اور حبیب جالب اور منصور قیصر سے ملے ،اور عبدالغفور کی فرمائش پر آرنلڈ بینٹ کی کتاب "HOW TO LIVE ON 24 HOURS A DAY" کا ترجمہ صبح کرنا شام کا کے نام سے کیا، یہی سلیم اختر کی پہلی کتاب تھی جو ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔ انہی دنوں میں سلیم اختر کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی لیکن اس محبت کا انجام روایتی یعنی ناکامی کی صورت میں سامنے آیا، ڈاکٹر سلیم اختر اس ناکامی کا ذمہ دار اپنے آپ کو ٹھہراتے ہیں، اس محبت کے زیر اثر انہوں نے حنیف رامے کے ہفت روزہ ''نصرت'' کے لیے ایک مضمون ''شرم یا اک ادائے نازک'' لکھا جو ان کا پہلا نفسیاتی مضمون تھا، اس کے بعد اسی رسالے میں انہوں نے کئی نفسیاتی مضامین لکھے جو ۱۹۶۴ء میں عورت جنس اور جذبات کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آئے یہ ان کی پہلی طبع زاد کتاب تھی جو اب تک مسلسل شائع ہوتی آ رہی ہے۔ آوارہ گردی کی زندگی سے تنگ آ کر ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی زندگی کی معمولات میں تبدیلی لانے کا فیصلہ کیا اور ایم۔ اے اردو کرنے کی ٹھان لی، ۱۹۶۱ء میں بطور پرائیوٹ امیدوار پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو کا

امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرلیا، کچھ عرصہ بعدان کی شادی ہوگئی، شادی کے معاملے میں برادری والوں نے ان کی شدید مخالفت کی لیکن وہ ڈٹے رہے اور آخر کارخاندان والوں نے ان کے آگے ہتھیار ڈال دیے یوں سعیدہ بیگم ان کی شریکِ حیات بن کران کی زندگی میں آگئیں، اسی زمانے میں پنجاب پبلک سروس کمیشن سے اردو لیکچرار کے لیے امتحان دیا اور کامیابی حاصل کر کے بطور اردو لیکچرر ملتان کے ایمرسن کالج میں تعینات ہو گئے ۔بعدازاں گورنمنٹ کالج لاہور پوسٹنگ ہوگئی، بعدازاں ۱۹۷۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو تنقید کا نفسیاتی دبستان کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی سند لی۔

یکم اپریل ۱۹۶۲ء کوسلیم اختر کی شادی سعیدہ سے ہوئی اور وہ اپنی بیگم کے ساتھ ملتان آ گئے، ۵ جنوری ۱۹۶۲ء کوانہوں نے ایمرسن کالج ملتان میں بطور اردو لیکچرر جوائنگ دی۔ درس وتدریس کا یہ سلسلہ ۱۹۷۰ء تک چلتا رہا، ڈاکٹر سلیم اختر کے ہاں تین اولادیں، دو بیٹیاں ارم، سائیکی اور ایک بیٹا جودت تینوں ملتان میں ہی پیدا ہوئے، ڈاکٹر سلیم اختر اور ان کی بیگم نے اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی، اپنی بیگم سعیدہ کی رفاقت میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک خوشحال اور کامیاب زندگی بسر کی، بیگم کے احساس ذمہ داری اور ہمدردانہ رویے کی وجہ سے انہیں اپنے ادبی سفر کے دوران کسی قسم کی پریشانی یا تھکن کا احساس نہ ہوا اور وہ مسلسل اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرتے رہے، اپنی بیگم کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے وہ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں۔

> شادی کے وقت صرف ایف اے، سی۔ٹی تھی، اس نے سوچا کہیں میرے ایم اے پاس شوہر کو ایف اے کی وجہ سے کسی طرح کا احساس کمتری نہ ہو چنانچہ ملازمت، گھر، بچوں اور میری ذمہ داری کے ساتھ ساتھ بی اے، بی ایڈ، ایم اے (اردو) اور ایم۔ایڈ کیا میں نے ایم اے سیکنڈ دویشن میں کیا جبکہ اس نے فرسٹ ڈویژن میں۔وہ تو ڈاکٹریٹ کرنے پر تلی بیٹھی تھی مگر میں نے ہاتھ جوڑے۔۔۔کم از کم ایک ڈگری تو میرے پاس رہنے دو۔ پہلے اپنے (اب سائیکی اور جودت کے) بچوں کی تعلیم وتربیت اور ساتھ ہی میری اصلاح بلکہ مجھے سیدھا کرنا۔۔۔ اضافی کارنامے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بالعموم بیویاں بوجھ ہوتی ہیں مگر سعیدہ نے مجھ پر بوجھ بننے کی بجائے میرا بوجھ سنبھالا۔یوں کہ وہ میرے لیے اعصابی تقویت کا باعث بن گئی۔ یہ ان کم یاب عورتوں اور نایاب بیویوں میں

سے ہے جنھیں کپڑوں ، جوتوں ، میک اپ، پرفیوم حتیٰ کہ زیورات تک کا بھی شوق نہیں ہے(۲)

ڈاکٹر سلیم اختر کی شخصیت متنوع خصوصیات کی حامل ہے ۔وہ ایک ہی وقت میں مورخ ، افسانہ نگار، محقق ،نفسیات دان، نقاد اور ایک استاد بھی ہیں، دن رات کی مسلسل محنت اور جدوجہد سے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو بہ طریق احسن نبھا رہے ہیں۔یوں تو ڈاکٹر سلیم اختر کے ادبی سفر کا آغاز بچپن سے ہی ہو گیا تھا لیکن وہ اس میدان میں ۱۹۶۲ء میں ملتان کے ایمرسن کالج میں بطور لیکچرر تعیناتی کے بعد ابھر کر سامنے آئے ،اسی زمانے میں انہوں نے اپنی مشہور تصانیف 'تنقیدی دبستان اور اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کی بنیادیں استوار کیں ۔اس کے علاوہ 'عورت جنس اور جذبات،نگاہ اور نقطے اور باغ و بہار کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ بھی اسی زمانے میں شائع ہوئیں، ،نفسیات ان کا پسندیدہ موضوع ہے،علم نجوم،علم الاعداد، دست شناسی خوابوں کی تعبیر اور غیبی مخلوقات سے بھی انہیں دلچسپی ہے،نفسیات کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر نے فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا ، یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تصانیف میں شعور ،لاشعور،تحت الشعور، اور تحلیل نفسی جیسے مسائل پر مباحث ملتے ہیں۔ بقول سلیم اختر بچپن میں نائٹ میئرز نے انہیں بیمار کر دیا تھا اور وہ اکثر رات کو نیند میں ڈر جایا کرتے تھے، وہ اپنے افسانوں میں پائے جانے والے نائٹ میئرز کو اپنے ذاتی تجربات کا عکس قرار دیتے ہیں۔

ان کے رفقاء کا کہنا ہے ہے کہ وہ نجی زندگی میں کافی شرمیلے کم گو اور مردم بیزار قسم کے آدمی واقع ہوئے ہیں ، ہر وقت پڑھنے لکھنے میں مگن رہتے ہیں ۔ڈاکٹر سلیم اختر ایک باعمل ،لائق ،مستند اور مقبول استاد ثابت ہوئے ہیں ، چالیس سالہ تدریسی زندگی میں انھوں نے اپنے شاگردوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بہترین کردار سازی بھی کی ، خاص طور سے طلبات نے ہمیشہ انہیں قابل بھروسہ استاد سمجھا۔مشکور حسین یاد سلیم اختر کے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر سلیم اختر سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو میں آئے پہلی ملاقات میں مجھے ڈاکٹر صاحب کی ذات میں اس عاشق کا دور دور نام ونشان نظر نہ آیا جس کا تذکرہ عام تھا۔ یہ شخص تو ہم جیسا عام نکلا بلکہ ایک اعتبار سے ہم

سے بھی گیا گزرا کہ ہم تو روزانہ کی بول چال میں ایک ادھم سا مچائے رکھتے تھے اور
ڈاکٹر سلیم اختر ہے کہ خاموشی سے آیا اور خاموشی سے چلا گیا، کسی نے کوئی بات
پوچھی تو جواب دے دیا ورنہ بلا وجہ ایک لفظ بھی منہ سے نکلے تو قسم ہے (۳)

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے مالک نیاز احمد کے ساتھ ڈاکٹر سلیم اختر کے دیرینہ تعلقات رہے ہیں ان کے یہ تعلقات سلیم اختر کے ملتان سے لاہور آنے کے بعد استوار ہوئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ابتدائی ایڈیشن سے لے کر حال تک نیاز احمد کے مطبع سے ہی شائع ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے علاوہ بھی نیاز احمد نے اپنے اشاعتی ادارے کے ذریعے سے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں بے مثال کردار ادا کیا ہے۔ اس ضمن میں ''سنگ میل پبلی کیشنز'' اور نیاز احمد کا نام اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ سلیم اختر کی معاصرانہ چشمک کی داستان خاصی طویل اور ادبی حلقوں میں مشہور ہے، دونوں فریقین گاہے بہ گاہے کتب و رسائل میں ایک دوسرے پر لفظوں کے تیر چلاتے رہے، ان کی یہ محاذ آرائی بھی اب ان کے ادبی منظر نامے کا ایک لازمہ بن چکی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر تقریباً سو کے قریب کتابیں لکھ چکے ہیں جن کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ صبح کرنا شام کا آزاد ترجمہ، "How to live on 24 hours a day" مصنف، آرنلڈ بینٹ، عمومی نفسیات، جدید ناشرین لاہور، ۱۹۶۱ء۔

۲۔ نگاہ اور نقطے تنقید، جدید ناشرین لاہور، ۱۹۶۸ء۔

۳۔ دلی والے میر امن کی باغ و بہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ تنقید، مرتبہ، میری لائبریری لاہور، ۱۹۶۸ء۔

۴۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۱ء۔

۵۔ تنقیدی دبستان مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۷۳ء۔

۶۔ تنقید اور تاریخِ ادب، جامع فہرستِ مطبوعاتِ پاکستان، نیشنل بک سنٹر آف پاکستان لاہور، ۱۹۷۳ء،

۷۔ ادب اور لاشعور، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۷۶ء۔

۸۔ تنوع مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۲ء۔

۹۔ حیاتِ جاوید، تلخیص، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۶ء۔

۱۰۔ تخلیق اور لاشعوری محرکات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۳ء۔

۱۱۔ ادب اور کلچر، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۶ء۔

۱۲۔ نفسیاتی تنقید، مجلس ترقی ءادب لاہور، ۱۹۸۶ء،

۱۳۔ انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۶ء۔

۱۴۔ جوش کا نفسیاتی مطالعہ، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

۱۵۔ پاکستان میں اردو ادب سال بہ سال، ۱۹۷۷ تا ۱۹۸۷ سالانہ ادبی جائزے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۱۶۔ تخلیق، تخلیقی شخصیات، تنقیدی کلیات، ایضاً، ۱۹۸۹ء۔

۱۷۔ داستان اور ناول: تنقیدی مطالعہ، ایضاً، ۱۹۹۱ء۔

۱۸۔ افسانہ اور افسانہ نگاری: تنقیدی مطالعہ، ایضاً، ۱۹۹۱ء۔

۱۹۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، کتابیات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۲ء۔

۲۰۔ مجموعہ ء تحقیق و تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۶ء۔

۲۱۔ اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۵ء۔

۲۲۔ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۵ء۔

۲۳۔ مغرب میں نفسیاتی تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۸ء۔

۲۴۔ اردو زبان کیا ہے، ایضاً، ۱۹۹۹ء۔

۲۵۔ شعور اور لاشعور کا شاعر غالب، فیروز سنز لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۲۶۔ غالب شناسی اور نیاز و نگار، الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۸ء۔

۲۷۔ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۲۸۔ اقبال شخصیت، افکار و تصورات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۲۹۔ اقبال اور ہمارے فکری رویے، ایضاً، ۱۹۸۲ء۔

۳۰۔ اقبال کی فکری میراث، بزم اقبال لاہور، ۱۹۹۲ء۔

۳۱۔ شرحِ ارمغان حجاز، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴ء۔

۳۲۔ میرا من سے میرا جی تک، ایضاً، ۲۰۱۱ء۔

۳۳۔ پاکستانی شاعرات: تخلیقی خد و خال، ایضاً، ۲۰۰۸ء۔

۳۴۔ تنقیدی اصطلاحات: توضیحی لغت، ایضاً، ۲۰۱۱ء۔

۳۵۔ نظر اور نظریہ، ایضاً، ۱۹۸۹ء۔

۳۶۔ بنیاد پرستی، ایضاً، ۱۹۹۶ء۔

۳۷۔ کلام نرم و نازک، ایضاً، ۲۰۰۴ء۔

۳۸۔ تین بڑے نفسیات دان، ایضاً، ۱۹۹۴ء۔

۳۹۔ اصطلاحات سازی، تاریخ، مباحث، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۳ء۔

۴۰۔ پاکستانی ادب، انتخابِ حصہ نثر، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۱۹۹۴ء۔

۴۱۔ خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی، شریک مرتبین شبنم شکیل، خالدہ حسین، وزارت ترقی خواتین، حکومت پاکستان اسلام آباد، ۲۰۰۵۔

۴۲۔ فکر اقبال کے منور گوشے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۴۳۔ اقبال کا ادبی نصب العین، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۴۴۔ علامہ اقبال، حیات، فکر و فن، مقالات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۴۵۔ اقبالیات کے نقوش، اقبال اکیڈمی پاکستان، ۱۹۷۷ء۔

۴۶۔ اقبال ممدوحِ عالم، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۸ء۔

۴۷۔ اقبال شعاعِ صد رنگ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۸ء۔

۴۸۔ ایران میں اقبال شناسی کی روایت، ایضاً، ۱۹۸۳ء۔

۴۹۔ اقبال شناسی اور فنون، بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۵۰۔ فکرِ اقبال کا تعارف، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۹ء۔

۵۱۔ لوس کلوڈ کی فرانسسی کتاب کے انگریزی ترجمہ از ملا عبدالمجید سے ماخوذ، ۱۹۸۴ء۔

۵۲۔ عورت جنس اور جذبات، مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۵۳۔ ہماری جنسی اور جذباتی زندگی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۵ء۔

۵۴۔ عورت جنس کے آئینے میں، ترجمہ، ایضاً، ۱۹۷۶ء۔

۵۵۔ مرد جنس کے آئینے میں، ترجمہ، ایضاً، ۱۹۷۶ء۔

۵۶۔ شادی جنس اور جذبات، ترجمہ، ایضاً، ۱۹۷۶ء۔

۵۷۔ سستائیے اور زندگی بڑھائیے، ترجمہ، "Relax and live"، از جوزف اے کینیڈی، مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۷۴ء۔

۵۸۔ خود شناسی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۴ء۔

۵۹۔ ضبط کی دیوار، ناولٹ، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۶۰۔ کڑوے بادام، افسانوی مجموعہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۶۱۔ کاٹھ کی عورتیں، افسانوی مجموعہ، پولیمر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۰ء۔

۶۲۔ مٹھی بھر سانپ، افسانوی مجموعہ، وکٹری بک بنک لاہور، ۱۹۹۲ء۔

۶۳۔ چالیس منٹ کی عورت، افسانوی مجموعہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۲ء۔

۶۴۔ آدھی رات کی مخلوق، افسانوی مجموعہ، الرزاق پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۹ء۔

۶۵۔ نرگس اور کیکٹس، افسانوی کلیات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۶۶۔ جرسِ غنچہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۶۷۔ اک جہان سب سے الگ، سفرنامہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء۔

۶۸۔ عجب سیر تھی، سفرنامہ، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۲ء۔

۶۹۔ نشانِ جگرِ سوختہ، آپ بیتی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۷۰۔ درشن جھروکہ، خاکے، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۹ء۔

۷۱۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ایضاً، ۱۹۱۷ء۔

۷۲۔ اصطلاحات سازی: تاریخ، مسائل، مباحث، ۲۰۱۵ء۔

۷۳۔ تنوع، ایضاً، ۲۰۱۵ء۔

۷۴۔ مرۃ العروس کا تجزیاتی مطالعہ، ایضاً، ۲۰۰۵ء۔

۷۵۔ انار کلی کا تجزیاتی مطالعہ، ایضاً، ۲۰۰۰ء۔

۷۶۔ خوشگوار اور مطمئن زندگی گزارئیے، ایضاً، ۲۰۱۶ء

۷۷۔ چھ افسانے، ایضاً، ۲۰۰۴ء۔

۷۸۔ چھ افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ، ایضاً، ۲۰۰۴ ے ء۔

۷۹۔ اردو شاعری، اولیول، ایضاً، ۲۰۰۲ ے ء۔

۸۰۔ اردو نصاب، اے لیول، ایضاً، ۲۰۰۳ء۔

۸۱۔ اردو نصاب، اولیول، ایضاً، ۲۰۱۲ء۔

۸۲۔ نیا نصاب اردو، ایضاً، ۲۰۰۶ء۔

ان کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر کے غیر مدون مضامین کی بھی ایک طویل فہرست ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف ادبی رسائل کے لیے لکھے ان مضامین کی تفصیلات ڈاکٹر شاہین مفتی کی کتاب ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و فن پاکستانی ادب کے معمار نمبر ۱۱۹، اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۱۵ء میں درج ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی نصابی کتب کا معیار بہت بلند ہے ان کتب کو مصنف نے جدید تعلیمی ضروریات کے تحت تیار کیا ہے جو اے لیول اور او لیول کی کلاسوں میں پڑھائی جاتی ہیں اس کے علاوہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، اصطلاحات سازی اور تنقیدی دبستان جامعاتی سطح پر طالب علموں کی علمی ضروریات کو پورا کرنے میں بہترین معاون ثابت ہو رہی ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں پاکستان اور بھارت کے کئی مصنفین نے ان پر مضامین اور کتابیں لکھ کر انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ ہمسفر بگولوں کا از ڈاکٹر طاہر تونسوی، لاہور۔ ۱۹۸۵ء۔

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت نقاد از ڈاکٹر جلیل اشرف، انڈیا، ۱۹۹۸ء۔

۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر ایک مطالعہ مرتبہ، تاج سعید، سپوتنک لاہور، ۲۰۰۱ء۔

۴۔ ذوقِ سلیم مرتبہ، جاوید اقبال ندیم، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر اشاریہ، مرتبہ، محمد سعید، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

۶۔ ڈاکٹر سلیم اختر، جہت ساز قلم کار، ڈاکٹر طاہر تونسوی، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۷۔ مکالماتِ سلیم، انٹرویوز، مرتبہ، عاصمہ اصغر، ۲۰۱۲ء۔

۸۔ رقعاتِ مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر سلیم اختر، مرتبہ، خالد ندیم، ۲۰۱۲ء

۹۔ ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و فن، پاکستانی ادب کے معمار نمبر ۱۱۹، از شاہین مفتی، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے ملکی اور غیر ملکی سطح پر منعقد ہونے والی علمی و ادبی کانفرنسوں میں شرکت کی اور اپنے تحقیقی اور تنقیدی مقالات پڑھے۔

۱۔ ''اقبال انٹرنیشنل کانفرنس، جامعہ پنجاب لاہور، ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۹۸ء۔

۲۔ ''بین الاقوامی فکر اقبال کانفرنس''، خانہ فرہنگ، ایران لاہور، ۱۹۹۶ء۔

۳۔ ''انٹرنیشنل جوش صدی سمینار کراچی'' ۱۹۹۹ء۔

۴۔ ''غالب بین الاقوامی سمینار''، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، ۱۹۸۸ء۔

۵۔ ''میر تقی میر سمینار''، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، ۱۹۹۹ء۔

پاکستان کے مختلف علمی، ادبی اور تہذیبی اداروں میں ڈاکٹر سلیم اختر نے رکن کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ دائمی رکنیت، اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور۔

۲۔ مستقل رکن، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد۔

۳۔ رکن، مرکزی فلم سنسر بورڈ، لاہور۔

۴۔ رکن، مجلسِ دفتری زبان حکومتِ پنجاب۔

۵۔ رکن، لاہور آرٹس کونسل۔

ملکی و غیر ملکی رسالوں میں شائع ہونے والے خصوصی گوشے۔

۱۔ سیپ، کراچی، اگست، ستمبر، ۱۹۷۵ء۔

۲۔ ماہ نو، لاہور، جنوری، ۱۹۸۴ء۔

۳۔ الفاظ، کراچی، مارچ، ۱۹۸۴ء۔

۴۔ افکار، کراچی، جون، ۱۹۸۵ء۔

۵۔ فنون، لاہور، دسمبر، ۱۹۸۷ء۔

۶۔ بیسویں صدی، نئی دہلی، اپریل، ۱۹۸۴ء۔

۷۔ تخلیق، لاہور، اگست، ۱۹۹۵ء۔

۸۔ دنیائے ادب، کراچی، جون، ۲۰۱۲ء۔

۹۔ سیپ، کراچی، اگست، ۲۰۱۲ء۔

۱۰۔ مسلک، ملتان، ۱۹۹۹ء۔

۱۱۔ راوی، اگست، ۱۹۹۹ء۔

۱۲۔ چہارسو، راولپنڈی، اپریل، ۲۰۰۰ء۔

۱۳۔ بیاض، لاہور، مارچ، ۲۰۰۳ء۔

۱۴۔ شام وسحر، لاہور، مارچ، ۲۰۰۷ء۔

۱۵۔ وجدان، لاہور، مارچ، ۲۰۰۹ء۔

۱۷۔ مجلس فروغ ادب اردو، دوحہ، قطر، ۲۰۱۴ء۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی خدمات کے صلے میں حکومتِ پاکستان اور مختلف ادبی اداروں کی طرف سے کئی ایک اعزازات سے نوازا گیا جن کی تفصیلات درج ذیل ہے۔

۱۔ صدارتی تمغہ حسن کارکردگی برائے ادب، ۲۰۰۷ء۔

۲۔ داود ادبی ایوارڈ برائے تحقیق وتنقید، ادب اور لاشعور ۱۹۷۲ء۔

۳۔ گلڈ انعام برائے تنقید ۱۹۸۲ء۔

۴۔ نیاز فتح پوری ایوارڈ ۱۹۹۳ء۔

۵۔ اٹھارواں عالمی فروغ ادبِ اردو، دوحہ قطر ۲۰۱۴ء۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے جامعاتی سطح پر ایم۔اے، ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی، کے طلباء کے مقالات کی نگرانی کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔

۱۔ سید عابد علی عابد: شخصیت وفن، از ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ، بہاوالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۸۹ء۔

۲۔ علی عباس حسینی: حیات اور فن، از ڈاکٹر اسلم عزیز درانی، ایضاً، ۱۹۸۹ء۔

۳۔ فیض احمد فیض: شخصیت وفن، از ڈاکٹر صلاح الدین حیدر، ایضاً، ۱۹۹۱ء۔

۴۔ اردو افسانے میں ابنارمل کردار، ایضاً، از ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی، ۲۰۰۸ء۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر نے قومی سطح پر دیئے جانے والے ادبی انعامات کے موقوں پر منصفی کے فرائض بھی سرانجام دیئے جن کی تفصیلات یہ ہیں۔

۱۔ ہجرہ ایوارڈ، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد۔

۲۔ پانچواں عالمی فروغ ادبِ اردو ایوارڈ، دوحہ قطر ۲۰۰۰ء۔

۳۔ پروین شاکر ٹرسٹ ایوارڈ، اسلام آباد ۲۰۰۰ء۔

۴۔ قومی اقبال ایوارڈ، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۲ء، ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۴ء، ۱۹۹۵ء۔

۵۔ احمد ندیم قاسمی ایوارڈ، لاہور، ۲۰۰۱ء۔

ب۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: ایک تعارف

تعارف: گراہم بیلی نے ۱۹۳۴ء میں "A history of urdu literature" کے نام سے اردو ادب کی ایک مختصر تاریخ انگریزی زبان میں لکھی جس کا ترجمہ ڈاکٹر محی الدین قاری زور نے ۱۹۴۰ء میں تاریخ ادب اردو کے نام سے کیا، اس کے بعد ڈاکٹر اعجاز حسین نے مختصر تاریخ ادب اردو لکھی اور یہی کتاب اردو ادب کی پہلی باقاعدہ مختصر تاریخ تھی اس کے بعد کئی مورخین نے اردو کی مختصر ادبی تواریخ لکھیں جن میں صحیفہء تاریخ اردو از سید محمود رضوی مخمور اکبر آبادی، ادبِ عزیز از ملک نذیر احمد، اردو ادب کی تاریخ از نسیم قریشی، تعارف تاریخ اردو از ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، مختصر تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر محمود بریلوی، تاریخ زبان اردو از صغیر احمد جان، اردو ادب کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر انور سدید، اور اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر سلیم اختر اہم ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی ادبی تاریخ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کو ہر نئی اشاعت کے ساتھ نئے سرے سے مرتب کیا ہے تا کہ اس کتاب میں نئی دریافتوں اور ادب کے جدید مباحث و میلانات بھی شامل ہو سکیں، مصنف نے ساری عمر اس کتاب کو بنانے سنوارنے میں لگا دی اور سال بہ سال کے مسلسل نئے مضامین کی شمولیت کی وجہ سے ۲۵۶ صفحات پر مشتمل اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اب ۷۲۰ صفحات پر پھیلی ایک بسیط تاریخ کی صورت اختیار کر چکی ہے، تحریف و اضافت کی یہی روش اس کتاب کو دیگر مختصر ادبی تواریخ سے ممتاز کرتی ہے اور عام قاری اور اردو ادب کے طالب علم کی پسندیدگی کا سبب بنتی ہے، ۱۹۷۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ کتاب مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ خاصی متنازعہ بھی ثابت ہوئی، اردو ادب کے محققین اور ناقدین نے مصنف پر اقربا پروری، تعصب، اور ناتجربہ کاری کے الزامات عائد کیے، مصنف کے اندازِ تحریر اور مخالفت پر مبنی بیانات پر سب سے زیادہ لے دے ہوئی۔ تیسویں ایڈیشن کے پیش لفظ میں ڈاکٹر سلیم اختر اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> کتاب کے عنوان میں ''مختصر ترین'' چونکا دینے والے الفاظ ثابت ہوئے چنانچہ اس کی وجہ سے ادبی کالموں اور طنزیہ مضامین میں اس کا ذکر ہوتا رہا حالانکہ ''مختصر ترین'' سے صرف اظہارِ عجز مقصود تھا، لیکن اس ''مختصر ترین'' نے مجھ پر بہت بھاری ذمہ داری کا

بوجھ ڈال دیا کیونکہ ''مختصر ترین'' کا مطلب سرسری بنانا نہ تھا اس پر مستزاد یہ کہ تاریخ ادب میں بے شمار نام آتے ہیں جبکہ نا بکوف کے الفاظ میں ادیبوں کی اکثریت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ دو بڑے ناموں کے درمیان محض ہائفن ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے صرف ان ہی ادبی شخصیات، وقوعات اور کتب کا تذکرہ کیا گیا جو ہر لحاظ سے ادب میں دائمی اہمیت اختیار کر چکی ہیں اور ان کے تذکرہ میں بھی بلحاظ اہمیت اور وقعت طوالت یا اختصار سے کام لیا گیا اس ضمن میں بے جا طوالت سے احتراز کرتے ہوئے بالعموم اجمال و اشارات پر انحصار کیا گیا۔ اسی طرح مصنفین کی صرف معروف اور زندہ و جاوید تصانیف کا حوالہ دیا گیا اور یوں کتاب کو کیٹلاگ بنانے کی کوشش کی گئی البتہ اہم ادبی وقوعات اور اشاعت کتب وغیرہ کے سلسلہ میں سنین کے تعین میں خصوصی کاوش کی گئی ہے، بعض سنین پر محققین اور ناقدین کا اتفاق نہیں سو جس سنہ پر اکثریت کا اتفاق پایا اسے قبول کر لیا۔ ہجری اور عیسوی سنہ کی بنا پر بعض اوقات خاصی الجھنیں ہوتی ہیں اس لیے جہاں تک ہو سکا دونوں سنین فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اسی طرح ادبی اور بالخصوص لسانی امور میں برپا علمی نزاعات کا ذکر تو کیا گیا مگر صرف تفہیم و تشریح کی حد تک، ان مباحث کو سلجھانے کی سعی میں مزید الجھانے کی کوشش نہیں کی، نہ کسی ایک نظریے کو دیگر نظریات پر فوقیت دی گئی۔ (۴)

ڈاکٹر سلیم اختر کو اپنی تمام کتابوں میں اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ سب سے زیادہ پسند ہے، اس پسندیدگی کی وجہ ان کی تمام عمر کی وہ محنت ہے جو انہوں نے اس کتاب کو بنانے سنوارنے کے لیے کی، ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' پاکستان کی بیسٹ سیلر کتاب بن چکی ہے اور اب تک اس کے تیس سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ کتاب سی۔ایس۔ایس، کے نصاب میں شامل ہے، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے اس کتاب کا ایک ایڈیشن خرید کر اردو ادب کی تاریخ کا نصاب مرتب کیا ہے اس کے علاوہ یہ کتاب پی۔ایس۔سی اور پاکستان کی کئی جامعات میں نصاب کی سی اہمیت رکھتی ہے۔

ترتیبِ ابواب: تذکرہ نویسی کی روایت کا اگر جائزہ لیا جائے تو اکثر تذکروں کی تقسیم شعراء کے ناموں

کی ہجائی ترتیب پر کی گئی ہے، محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات میں پہلی مرتبہ زمانی ادوار بندی کا تجربہ کیا اور شعراء کو زمانی اعتبار سے تقسیم کر کے ان کے حالاتِ زندگی قلمبند کیے، اردو ادب کی تاریخوں میں ادوار بندی کا کوئی مخصوص کلیہ متعین نہیں ہے بعض مورخین نے تاریخ ادب کو زمانی اعتبار سے تقسیم کیا ہے تو بعض نے علاقائی لحاظ سے، کہیں ہجائی ترتیب ملتی ہے تو کہیں پر اصنافِ ادب کی تقسیم کا تصور ملتا ہے لیکن رام بابو سکسینہ کی تاریخِ ادبِ اردو کے بعد عموماً ادبی تواریخ کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے قلمبند کرنے کا رواج عام نظر آتا ہے، جدید ادبی تواریخ میں ابواب کی تقسیم زمانی اعتبار سے اس طرح کی جاتی ہے کہ تاریخیت ایک مربوط تسلسل کے ساتھ مختلف زمانوں کی کڑیوں کو جوڑتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی اپنی ادبی تاریخ میں اسی اندازِ تحریر کو پیشِ نظر رکھا ہے اس کتاب میں مصنف نے کل انتیس ابواب قائم کیے ہیں جن کے تحت اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اس کے علاوہ کتاب کے آغاز میں ایک مختصر سا پیش لفظ اور ایک مقدمہ ''تاریخ ادب مقاصد و محرکات'' کے نام سے لکھا ہے جس میں تاریخ کی تعریف، مطالب ادب، ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں اور مقاصد و محرکات پر بحث کی ہے، اس کتاب کے مختلف ابواب کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

پہلا باب: طاؤس، تختِ طاؤس اور تخلیق: اس باب کی ذیل میں مصنف نے تاریخ ادبیاتِ عالم کے آغاز، تخلیق اور تخلیق کار پر پڑنے والے سماجی، معاشرتی، سیاسی، مذہبی، اور جغرافیائی اثرات، تخلیق کار کی نفسیات اور تخلیق کے عمل پر روشنی ڈالی ہے، اس کے علاوہ شعر و ادب کی درباری حیثیت اور درباری ماحول کے ادب پر پڑنے والے منفی و مثبت اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس باب میں ہندوستانی ادب کے بادشاہی دور سے وابستہ چند دلچسپ درباری واقعات بھی قلمبند کیے گئے ہیں جو خاص اہمیت کے حامل ہیں، ڈاکٹر سلیم اختر نے اس باب میں تخلیقی عمل کا جائزہ نفسیاتی تنقید کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

دوسرا باب: ''اردو ہے جس کا نام'': اس باب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو زبان کے آغاز و ارتقاء، لسانی تغیرات، زبان کے ماخذات، رسم الخط، غیر ملکی زبانوں کے اردو پر پڑنے والے اثرات، اردو زبان کی علاقائی حیثیت اور اردو زبان کے حوالے سے پیدا ہونے والے تنازعات پر بحث کی ہے۔

تیسرا باب: ''اردو زبان: آغاز کے بارے میں نظریات''۔ اس باب میں محققین کے اردو زبان کے

آغاز بارے میں پیش کردہ مختلف نظریات کی روشنی میں زبان کے آغاز و ارتقاء پر بحث کی ہے، تمام اہم نظریات جیسے برج بھاشا اور اردو، پنجاب میں اردو، دکن میں اردو، سندھ میں اردو، سرحد میں اردو، بلوچستان میں اردو، اردو اور شاہجہان کا زمانہ، اردو اور اکبر کا زمانہ، اردو اور قدیم ویدک بولی، اردو اور مرہٹی، اور منڈا زبان اور اردو کے تعلق کا احاطہ کیا گیا ہے۔

چوتھا باب: اصلاحِ زبان: اس عنوان کے تحت خان آرزو سے لے کر امام بخش ناسخ تک کی اصلاحِ زبان کی تحریک کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں عربی فارسی الفاظ کی اردو زبان میں آمیزش، ہندی اور سنسکرت الفاظ کے اخراج، ردِعمل کی تحریک اور متروک الفاظ کی تفصیلات درج ہیں۔

پانچواں باب: ''زبان: قومی اور بین الاقوامی تناظر'': اس باب میں معاشرے کے لیے زبان کی اہمیت، لفظوں کے تغیر و تبدل، زبان کی شکست و ریخت، اور اہمیت و افادیت جیسے موضوعات زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔

چھٹا باب: ''تخلیقی زاویے اور اصنافِ ادب'': یہ باب قدیم و جدید ادبی اصناف، مستعار لی گئی اصنافِ ادب، مشاعرے کی روایت اور شاعری پر پڑنے والے اس کے اثرات، خواتین کی شاعری اور زنانہ مشاعروں کے تذکرے پر مبنی ہے۔

ساتواں باب: ''جنوبی ہند میں اردو ادب'': دکنی ادب کے احوال پر مبنی اس باب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے جنوبی ہند میں اردو ادب کے آغاز و ارتقاء کے حوالے سے صوفیاء کے کردار پر روشنی ڈالی ہے اس کے علاوہ دکنی شاعری، نثر، دکنی ادب کی اہمیت، اردو کی پہلی نثری تصنیف، قلی قطب شاہ، پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ، اور ولی دکنی کا ذکر کیا ہے۔

آٹھواں باب: ''شمالی ہند میں اردو ادب'': اس باب میں مصنف نے شمالی ہند کا ادبی منظر نامہ پیش کیا ہے اس عنوان کے ذیل میں ڈاکٹر سلیم اختر نے دلی میں نمو پانے والی اصنافِ ادب، تذکروں کی روایت، ایہام گوئی کی تحریک، ریختہ اور دلی کے اہم شعراء کا احوال قلمبند کیا ہے۔

نواں باب: ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'': لکھنؤ کی ادبی صورتِ حال پر مبنی اس باب میں مصنف نے درباری شاعری کی روایت، حکمران شعراء، ریختی، مثنوی، مرثیہ، اصلاحِ زبان، اور اردو سفر نامے کی روایت کے

آغاز پر بحث کی ہے۔

دسواں باب: دہلی کے نامور شعراء'': یہ باب دلی کے زوال پذیر معاشرے کے ادبی منظر نامے پر مشتمل ہے، اس باب میں غالب، بہادر شاہ ظفر، ذوق، مومن اور ان کے ہم عصر شعراء کا ذکر ہے، ضمنی بحث میں پاکستان میں غالب شناسی کی روایت پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

گیارھواں باب: ''اردو نثر کا ظہور، مستشرقین اور یورپین شعرائے اردو'': ڈاکٹر سلیم اختر نے اس باب میں انگریزوں کے دورِ حکومت میں شروع ہونے والے ادبی اور لسانی تغیرات کا جائزہ پیش کیا ہے اس کے علاوہ اس باب میں مستشرقین کی ادبی سرگرمیوں، انگریز شعرائے اردو، اور انگریزوں کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے اس باب میں روس میں اردو کے فروغ اور مطالعہ پر تازہ تحقیقی بحث بھی شامل ہے۔

بارھواں باب: ''داستان سرائے'': یہ باب خالصتاً داستانوی ادب سے متعلق ہے مصنف نے اس باب میں داستان گوئی کی روایت کے آغاز، داستانوں کی تصوراتی فضا اور اردو کی اہم داستانوں کے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہیں۔

تیرھواں باب: ''فورٹ ولیم کالج اور باغ و بہار'': اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر مبنی اس باب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ایسٹ انڈیا کمپنی، ڈاکٹر جان گلکرسٹ، فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات، سلیس نگاری کی روایت اور اردو کی معروف داستان باغ و بہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔

چودھواں باب: ''سرسید تحریک اور ادبی نشاۃ ثانیہ'': سرسید کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات اس باب کا اہم موضوع ہیں، اس باب میں مصنف نے سرسید تحریک اور ان کے رفقاء کی خدمات، سرسید تحریک کے رد عمل یعنی اودھ پنچ خصوصاً اکبر الہ آبادی کی مزاحیہ شاعری میں سرسید کی شخصیت اور نظریات پر طنز پیرایہ سخن دانی کو موضوع بحث بنایا ہے، اس کے علاوہ اس باب میں انجمن پنجاب اور آزاد نظم، رومانیت اور اسماعیل میرٹھی کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر موجود ہے۔

پندرھواں باب: ''ادب اور پنجاب'': اس باب میں پنجابی اور اردو زبان کے تعلق، پنجاب میں اردو

ادب کے آغاز و ارتقاء، وارث شاہ کی ہیر، پنجابی غزل، پنجاب میں اردو شاعری، فکشن، لاہور کے مشاعرے، پنجابی شاعری کے مشاعرے، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، اور آخر میں پنجاب کی ادبی محفلوں کے انحطاط جیسے موضوعات شامل ہیں۔

سولہواں باب: ''مرثیہ عہد بہ عہد'': یہ باب برصغیر میں مرثیہ کی عہد بہ عہد ترقی، دکن اور لکھنوء کے حکمرانوں کے شعری ذوق، مرثیہ کے آغاز و ارتقاء، مختلف ادوار میں مرثیہ کی ہیت، کربل کتھا، میر انیس اور میرزا دبیر کے عہد میں مرثیہ کے دورِ عروج، اور جدید مرثیہ کے حوالے سے پاکستان اور ہندوستان کے نامور مرثیہ نگاروں کے ذکر پر مبنی ہے۔

سترہواں باب: ''اردو ڈراما'': اس باب میں مصنف نے ڈرامے کی تعریف، برصغیر میں ڈرامے کی روایت اور ارتقاء کا جائزہ پیش کیا ہے مصنف نے اردو زبان کے پہلے ڈرامے کی متنازعہ صورت حال پر تفصیلی بحث کی ہے، اس کے علاوہ اس باب میں اردو کے مشہور کلاسیکی ڈرامہ نگاروں واجد علی شاہ، امانت لکھنوی، آرام، طالب بنارسی، رونق، آغا حشر اور عبدالحلیم شرر کی ڈرامہ نگاری پر بحث کی گئی ہے، جدید اردو ڈرامہ کے ذیل میں مصنف نے سید امتیاز علی تاج، مرزا دیب، منٹو، امجد اسلام امجد، حسینہ معین، اور دیگر ترقی پسند اور ٹیلی وژن ڈرامہ نگاروں کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

اٹھارواں باب: ''عبوری دور کا ادب'': اس باب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ان ادیبوں کی تخلیقات اور ادبی خدمات کا ذکر کیا ہے جو کلاسیکی عہد سے نکل کر جدید نظریات و رجحانات کے تحت ادب تخلیق کرنے کا راستہ ہموار کر رہے تھے، جن ادیبوں نے اردو ادب میں جدید رجحانات کو فروغ دیا ان کے ذیل میں مصنف نے عبدل الحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، رشیدۃ النساء، سید سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، اور یاس یگانہ چنگیزی، وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ اس باب میں اردو نظم کی جدید اصناف، سانٹ اور نظم معراء کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

انیسواں باب: ''محرم را زِ درونِ میخانہ'': ڈاکٹر علامہ محمد اقبال سے متعلق اس باب میں ان کا شجرہ ء نصب، سوانح حیات، سیاسی سرگرمیاں، فکری و فنی ارتقاء، فلسفہ ءخودی، اقبالیات، اور اقبال شناسی جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

بیسواں باب: ''ترقی پسند ادب کی تحریک'': ترقی پسند ادب کی تحریک کے عنوان سے قائم کردہ اس باب کے ذیل میں مصنف نے ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقاء اس کے اغراض ومقاصد، ترقی پسند تحریک کے بانیان کا سیاست میں عمل دخل، تخلیقی مقاصد، مسائل ومشکلات، گروہ بندیاں، جنسی موضوعات کا رجحان، ادبِ جدید کی نئی جہتیں اور اس کے ردِعمل کی صورتِ حال اور حلقہء اربابِ ذوق کے قیام کی تفصیلات درج کی ہیں۔

اکیسواں باب: ''اردو صحافت اور ادبی جرائد'': یہ باب اردو صحافت کے آغاز وارتقاء سے متعلق ہے، اس باب میں مصنف نے اردو کے پہلے اخبار جامِ جہاں نماں سے لے کر حال تک کے اخبارات ورسائل کا جائزہ پیش کیا ہے، اس عنوان کے تحت قلعہ معلیٰ کا اخبار، دہلی اردو اخبار، ہندوستان میں چھاپا خانے کی ابتداء، پنجاب میں صحافت کی صورتِ حال، مغربی اردو اخبار، تہذیب الاخلاق، اودھ پنچ، نگار، فنون، مخزن، اور دیگر اہم اخبارات ورسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔

بائیسواں باب: ''پاکستان میں اردو ادب کی نصف صدی'': اس باب میں تقسیم ہند کے بعد ہجرت اور فسادات کی المناکیوں کے زیرِ اثر تخلیق پانے والے ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، ترقی پسند تحریک کی فعالیت، پاکستان میں فکری مباحث، پاکستان میں پنپنے والی لسانی تشکیلات، حلقہء اربابِ ذوق، نئے شعری تجربات، اسلامی ادب، پاکستان کے حصے میں آنے والے نامور ادیب، اور اصنافِ ادب کی ترقی پذیر صورت حال اس باب کے موضوعات میں شامل ہیں۔

تیئسواں باب: ''پاکستان میں اردو نثر کا تخلیقی منظر نامہ'': اس باب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے پاکستان میں ناول نگاری، افسانہ نگاری، سفر نامہ نگاری، انشائیہ کی تاریخ اور تنازعات، سوانح عمری، اور بچوں کے ادب سے متعلق معلومات مہیا کی ہیں،

چوبیسواں باب: ''پاکستان میں تحقیق وتنقید'': اس باب میں پاکستان کے نامور نقادوں کے ادبی کارناموں، پاکستانی جامعات میں ہونے والی تحقیق کے معیار، اقبالیات پر ہونے والی نئی تحقیق وتنقید، تنقید کے ترقی پسند رجحانات، اور اردو کی ادبی تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پچیسواں باب: ''پاکستان میں شعر کی صورت حال'': پاکستان کی شعری صورتِ حال سے متعلق اس باب میں مشہور پاکستانی شعراء، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، ن م راشد، میراجی، احسان دانش، عبدالحمید

عدم، قتیل شفائی، ابن انشاء، حبیب جالب، شکیب جلالی، ساغر صدیقی، اور دیگر مشہور پاکستانی شعراء کا مختصر تعارف نمونہ کلام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

چھبیسواں باب: ''جوہر عورت کی نمود'': یہ باب خالصتاً شاعرات کے احوال پر مبنی ہے، ڈاکٹر سلیم اختر نے اس باب میں کلاسیکی خواتین شاعرات، شاعرات کے تذکروں اور پاکستانی شاعرات کا تعارف اور نمونہ کلام پیش کیا ہے۔

ستائیسواں باب: ''نئے رجحانات، تصوراتِ نو، نزاعی مباحث'': اس باب میں کلیات کی روایت، جدید شعری روایت و تجربات، اردو شاعری میں انگریزی الفاظ کی آمیزش، اور علامتی و تجریدی افسانہ نگاری کی تفصیلات درج ہیں۔

اٹھائیسواں باب: ''ظرافت کا لحاف، میڈ ان پاکستان'': مصنف نے اس باب میں اردو ادب میں مزاح نگاری کی روایت، اور پاکستان میں مزاح نگاری کر رجحانات کا احاطہ کیا ہے، مزاح نگاری کی روایت کے ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے سرسید تحریک کے ردِ عمل کے طور پر ابھرنے والی تحریک ''اودھ پنچ'' اور اکبر الہ آبادی کی شاعری کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ نثر میں مزاح کے حوالے سے سجاد علی انصاری، فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، قاضی عبد الغفار، پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی اور عہدِ جدید کے دیگر مزاح نگاروں کا تذکرہ اس باب میں شامل ہے، پاکستان میں مزاحیہ شاعری کا احوال بھی اس باب کا حصہ ہے، ضمیر جعفری، مجید لاہوری، دلاور فگار، انور مسعود، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، سرفراز شاہد اور چند نئے مزحیہ شعراء کا حال اور نمونہ کلام اس باب میں دیا گیا ہے۔

انتیسواں باب: ''معاصر تخلیقات کا جھروکہ'': یہ آخری باب مختلف ایڈیشنوں کے لیے لکھے جانے والے ضمیموں پر مشتمل ہے جس میں مختلف وقتوں کے اہم ادبی وقوعات، و کتابیات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۹ء تک کے ادبی منظر نامے پر مبنی سات ضمیمے اس باب کا حصہ ہیں جن میں جدید دور کی نظم و نثر کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ج۔ مصنف کا تحقیقی و تنقیدی رویہ: ایک تعارف:

ڈاکٹر سلیم اختر نے تحقیق وتنقید میں ہمیشہ اپنے مخصوص تجزیاتی انداز سے کام لیتے ہوئے کھلے بندوں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس کی وجہ سے ان پر تعصب اور اقرباء پروری کے الزامات بھی آتے رہے جو کسی حد تک درست بھی ہیں اس حوالے سے مصنف کی ایک روش قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے کبھی بھی ان الزامات کی تردید نہیں کی بلکہ الزامات کو خوش دلی سے تسلیم کیا اور اپنے اس روّیے کی وضاحت کرتے ہوئے تعصب اور ذاتی پسند و ناپسند کو محقق اور نقاد کی نفسیات کا لازمہ قرار دیا۔

تحقیقی روّیہ: تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کی تصانیف میں اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ،اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ ،اردو زبان کیا ہے اور انشائیہ کی بنیاد اہم ہیں، ان تمام کتب میں مصنف نے موضوعات کی تشریح وتعبیر کے لیے اختصار کی راہ اپنائی ہے لیکن اکثر مقامات پر ان کے تنقیدی مباحث کی وجہ سے ان کی تحریریں طویل ہو جاتی ہیں ،تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر قدیم ماخذات کے ساتھ ساتھ جدید تحقیقی مواد سے بھی بھرپور استفادہ کرتے ہیں وسیع مطالعے ،طویل تحقیقی وتنقیدی اور تخلیقی ریاضت سے کام لیتے ہوئے مصنف کتب و رسائل اور اخبارات میں چھپنے والے ادبی مقالات ومضامین پر تجزیے بھی اپنی کتب میں شامل کرتے رہتے ہیں، مصنف چونکہ افسانہ نگار بھی ہیں اس لیے ان کی تحقیقی وتنقیدی تحریروں میں افسانوی اور انشائی انداز کی جھلک بھی نظر آتی ہے اس طرح وہ نہ صرف تحریر کو قاری کے لیے دلچسپ بنا کر پیش کرتے ہیں بلکہ روایتی تحقیقی اصطلاحات اور مشکل الفاظ سے بھی تحریر کو پاک رکھتے ہیں ،یہی ہلکا پھلکا انشائی اندازِ تحریر ڈاکٹر سلیم اختر کے اسلوب کو دیگر محققین سے ممتاز بناتا ہے، اسی اسلوب کو ڈاکٹر گیان چند جین نے ''بولی ٹھولی کی زبان کا لپکا'' قرار دیا ہے، ڈاکٹر سلیم اختر اپنی تحریروں پر الفاظ کی گرانی مسلط کرنے کے بجائے سیدھا سادہ انداز اپنائے رکھتے ہیں تاکہ قاری کو کتاب کے مطالعے کے دوران لغت کا سہارا لینا نہ پڑے اور وہ روانی اور تسلسل سے مطالعہ کرتا جائے اور تاریخ وتحقیق کی کڑیوں کے ربط کو با آسانی سمجھ سکے۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ یہ کتاب مصنف کی مشہور ترین تحقیقی کاوش ہے اس کتاب کے کل ۲۹ ابواب ہیں اور اس کی پہلی اشاعت سنگ میل پبلی کیشنز کے زیر اہتمام ۱۹۷۱ء میں عمل میں آئی، یہ نسبتاً ایک تنقیدی تاریخ ہے مصنف نے اس کتاب میں نفسیاتی تنقید کی روشنی میں تخلیق اور تخلیق کار کا مطالعہ پیش کیا ہے اپنی اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر سلیم اختر کسی مخصوص نظامِ نقد کو تخلیق اور تخلیق کار کے مطالعہ کے لیے محدب

شیشہ بنا کر ادبی تاریخ قلمبند کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں اور بجا طور پر اسی روش کے تحت انھوں نے یہ کتاب تحریر کی ہے۔اس کتاب میں مصنف نے اردو ادب کے آغاز سے لے کر حال تک کے ادبی منظر نامے کا احاطہ مختصر مگر جامعہ انداز میں کیا ہے، چار سو سالہ ادبی تاریخ کو ایک کوزے میں بند کرنا نہایت دشوار کام تھا تاہم مصنف نے سالہا سال کی مسلسل محنت سے اس کتاب کو مربوط ادبی تواریخ کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، یہ کتاب اب تک اپنے ارتقائی سفر پر گامزن ہے اور سال بہ سال کی ادبی ترقی کا احاطہ کرتی رہتی ہے، قدیم ادب کے ساتھ ساتھ مصنف اس کتاب میں معاصر ادب کا بھی تحقیقی وتنقیدی جائزہ شامل کرتے رہتے ہیں، کتاب کے بعض مباحث نزاعی نوعیت کے بھی ہیں جن پر وقتاً فوقتاً لے دے بھی ہوتی رہتی ہے، اس کتاب کے نزاعات کے حوالے سے مصنف کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

> یہ کتاب میرے لیے عجیب تجربہ ثابت ہوئی کہ چھپتے ہی نزاعی بن گئی۔ادبی تواریخ کے نزاعات بالعموم تحقیقی اغلاط، ناقص مواد، غلط کوائف کی بنیاد پر جنم لیتے ہیں لیکن یہاں ادبی، تحقیقی، تنقیدی یا تاریخی نقطہ نظر کے برعکس خالص انا کا مسئلہ تھا، ناپسندیدگی ان معنوں میں سراسر ذاتی اور محض تھی کہ۔
>
> ۱۔ میرا نام کیوں نہیں آیا۔
>
> ۲۔ میرا ذکر تین سطر میں ہے جب کہ ''فلاں'' کا ساڑھے تین میں۔
>
> ۳۔ میں کیا ''فلاں'' سے کم تر ہوں جو ''اس'' کا ذکر مجھ سے چار پانچ انچ اوپر کیا گیا ہے۔
>
> ۴۔ اور یہ تو اس قابل ہی نہ تھا کہ اس کا ذکر ہوتا۔
>
> اس جرم کا مرتکب ہونے کی پاداش میں مجھے دشنامی خطوط لکھے گئے، ڈرایا دھمکایا گیا، کالم چھپے جن میں مجھے متصب اور گروہ پسند کہا گیا (یہ فراموش کرتے ہوئے کہ تین چار سو برس پر مبنی تاریخ ادب میں بھلا گروپ کے کتنے لوگوں کا تذکرہ ہوسکتا ہے) اخبارات میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑے گئے۔چائے پی کر کوسا گیا، حتیٰ کہ ایک پرنسپل نے تو

میری سالانہ رپورٹ بھی خراب کر دی۔ ان پہ مستزاد وہ حضرات بھی تھے جنہوں نے پہلے بُرا بھلا کہا، پھر آنے والے ایڈیشن میں نام نامی شامل کرانے کے لیے احباب سے سفارشیں کرائیں، کتابیں ارسال کیں، کوائف بھیجے اور بالآخر گلے شکوں کے خطوط لکھے گئے۔ (۵)

ان تمام مسائل اور مخالفتوں کے باوجود ڈاکٹر سلیم اختر اپنے مخصوص نقطہ نظر پر قائم رہے اور ان ہی شخصیات و واقعات کو اپنی کتاب میں جگہ دی جن کو لائق تحسین سمجھا۔

اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ یہ ڈاکٹر سلیم اختر کی دوسری اہم کتاب ہے، اسے ۱۹۹۵ء میں ''مقتدرہ قومی زبان'' کی طرف سے شائع کیا گیا یہ کتاب کل آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں زبان کی تعریف، اردو زبان کے قدیم نام، اردو زبان کا آغاز، زبان کی اصلاحی تحریکیں، اردو رسم الخط، اردو میں لغت نویسی، اردو قواعد، اردو میں تراجم، اور وضع اصطلاحات جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں پیچیدہ لسانی مباحث پر نہایت سادہ انداز میں گفتگو کی ہے تا کہ عام قاری کو بھی اردو لسانیات کے بارے میں آگاہی حاصل ہو سکے، اس کتاب میں زبان کی تشکیل، قوموں کے تہذیبی، ثقافتی اقدار، اور معاشرے کے اجتماعی رجحانات و میلانات کے زبان کے تغیر و تبدل پر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مواد کی پیشکش کے حوالے سے اس کتاب میں اختصار سے کام لیا گیا ہے جو کہ کتاب کے نام سے بھی ظاہر ہے اس کتاب میں مصنف نے پاکستان میں اردو زبان کی ترویج و نفاذ کے لیے کام کرنے والے اداروں کی کارکردگی اور مسائل پر بھی بات کی ہے، خاص طور سے وضع اصطلاحات کے معاملے میں پاکستان میں جو صورتِ حال رہی ہے اس کا خصوصی ذکر ہے، اس کے علاوہ گزشتہ ۶۵، ۷۰ برس سے پاکستان میں جو لسانی تبدیلیاں اردو زبان میں ہوئی ہیں جن میں علاقائی اور خاص کر انگریزی زبان کا زیادہ عمل دخل ہے ان تمام مسائل پر ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب میں تفصیلی بحث کی ہے۔

اردو زبان کیا ہے یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز کے زیر اہتمام ۲۰۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی اس کتاب کا بنیادی مواد ان کی کتاب ''اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ'' پر ہی مشتمل ہے جس میں اردو زبان سے متعلق لسانی مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، اس کتاب میں ایک نیا باب ''اردو لسانیات: نگاہِ بازگشت اور مستقبل

''کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔

پاکستان میں اردو سال بہ سال ادبی تحقیق کے حوالے سے یہ ایک اہم کتاب ہے، یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۸۸ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی، اس کتاب میں مصنف نے ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۷ء تک کے ادبی جرائد کی کارکردگی، اہم ادبی تصانیف اور ادب کی مختلف اصناف پر ہونے والی تحقیقی و تخلیقی کاوشوں کا جائزہ پیش کیا ہے، یہ کتاب معاصر ادب کا ایک طرح کا ریکارڈ بھی ہے جو آنے والے وقتوں میں محققین ادب کے لیے سود مند ثابت ہوگا، اس کتاب کا بھی ارتقائی عمل جاری وساری ہے مصنف سال بہ سال کی ادبی سرگرمیوں کا احوال کتابی شکل میں مرتب کرتے رہتے ہیں اس کتاب میں گیارہ ابواب قائم کیے گئے ہیں جن کی تفصیلات یہ ہیں۔

باب نمبر ۱۔ ادبی جرائد کے اقبال نمبر۔۔ایک جائزہ۔

باب نمبر ۲۔ ۱۹۷۸ء میں تنقید۔

باب نمبر ۳۔ نثر کی بیلنس شیٹ ۱۹۷۹ء۔

باب نمبر ۴۔ ۱۹۸۰ء نثری ادب کا کامیاب سال۔

باب نمبر ۵۔ ۱۹۸۱ء اردو فکشن کا سال۔

باب نمبر ۶۔ ادب میں تخلیقی تنوع کا سال ۱۹۸۲ء۔

باب نمبر ۷۔ ۱۹۸۳ء تخلیقی مدوجزر کا سال۔

باب نمبر ۸۔ پاکستان کا تخلیقی منظر نامہ، ۱۹۸۴ء۔

باب نمبر ۹۔ لوڈ شیڈنگ۔تخلیقات اور ۱۹۸۵ء۔

باب نمبر ۱۰۔ جمہوریت میں ادب کے ۳۶۵ دن۔۱۹۸۶ کا تخلیقی میزانیہ۔

باب نمبر ۱۱۔ ادب کا بارہ ماسہ ۱۹۸۷ء۔

ابتدائی طور پر اس سلسلے کی پہلی اشاعت میں گیارہ برس کے ادبی جائزے شامل تھے، مصنف کے خیال

میں ادبی جائزوں کی اساس تنقید پر استوار ہونی چاہیے، تخلیق اور تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ صاحب کتاب کے تخلیقی تعطل کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔

انشائیہ کی بنیاد انشائیہ دورِ جدید کی ایک معروف صنفِ ادب ہے جو یورپی ادب سے اردو ادب میں آئی انشائیہ کے آغاز وارتقاء کے حوالے سے محققین ادب میں خاصہ اختلاف پایا جاتا ہے، بعض محققین انشائیہ کے آغاز کے ضمن میں مولانہ محمد حسین آزاد کی تحریروں خاص کر ''نیرنگِ خیال'' کے مضامین کو اولین ماخذ قرار دیتے ہیں تو بعض باغ وبہار کی جڑوں میں انشائیہ کی جڑیں تلاش کرتے ہیں، بعض محققین کے خیال میں انشائیہ کا آغاز سرسید کے مضامین سے ہوا، ڈاکٹر وزیر آغا نے خود کو انشائیے کا موجد قرار دیا ہے۔

انشائیہ کی بنیاد میں ڈاکٹر سلیم اختر نے انشائیہ کے آغاز وارتقاء پر بحث کرتے ہوئے وزیر آغا کے دعوے کی سختی سے تردید کی ہے اس کتاب میں مصنف نے انشائیہ کے حوالے سے مختلف محققین کے تحقیقی مباحث اور نظریات پر بحث کی ہے جن کی روشنی میں انشائیہ کے آغاز کی کڑیاں ''ملا وجہی'' کی سب رس تک جا پہنچی ہیں، اس ضمن میں ماسٹر رام چند کو بھی قبل ذکر قرار دیا گیا ہے۔ گو کہ یہ کتاب معاصرانہ چشمک کی نمکینی سے بھرپور ہے لیکن انشائیہ کی تحقیق وتشریح کے لیے کافی سودمند ہے۔

تنقیدی رویہ ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی سفر کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ پیدائشی نقاد ہیں، طالب علمی کے ابتدائی زمانے سے ہی انھوں نے ،نازک مزاج شاعر: میر، اقبال بچوں کے شاعر کی حیثیت سے، خوشحال خاں خٹک، اکبر کی شاعری، غزل کی ابتداء، حالی غزل کے موڑ پر، نظیر اکبر آبادی: عوامی شاعر، اور غزل میں تصورِ محبوب جیسے موضوعات پر تنقیدی مضامین لکھے۔ ان ابتدائی مضامین میں گو کہ ان کا اسلوبِ تنقید سادہ اور معصومیت پر مبنی رہا لیکن ان مضامین سے ان کے تنقیدی شعور کی فطری رو کا پتہ چلتا ہے، ادب سے دلچسپی کی ایک وجہ ان کے والدِ محترم کا ادبی ذوق بھی ہے جس نے ڈاکٹر سلیم اختر کو اوائل عمری میں ہی ادبی حس عطا کی ان کے والد کے عبدالحمید عدم اور ابنِ انشاء جیسے اردو کے بڑے شعرا اور دیگر ادیبوں کے ساتھ مراسم تھے وہ بھی اس حد تک کہ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا ان ملاقاتوں میں اکثر ڈاکٹر سلیم اختر بھی اپنے والد کے ہمراہ ہوتے اور ان اصحاب کی صحبت کا اثر ان پر بھی پڑا اس کے علاوہ ان کے والد کو ادبی کتب ورسائل کے مطالعے کا بھی شوق تھا۔ یوں مصنف کو اپنے گھر میں ہی ادبی ماحول میسر آیا، یہ ان کے والد کی

سرپرستی اوران کی حوصلہ افزائی کا ہی اثر تھا کہ اتنی کم عمری میں انھوں نے اتنے مشکل موضوعات پر تنقیدی مضامین لکھنے کی ہمت کی۔

نگاہ اور نقطے ڈاکٹر سلیم اختر کی پہلی تنقیدی کتاب نگاہ اور نقطے ۱۹۶۸ء میں جدید ناشرین کے زیر اہتمام لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مصنف نے زیوس سے امیر حمزہ تک، منٹو خطوط کے آئینے میں، مرزا ہادی رسوا کا نظریہء ناول نگاری، شاعری میں زنانہ پن کی مثال ریختی، غالب خطوط کے آئینے میں، غالب کی نرگسیت، مردِ عاشق کی مثال، باغ و بہار کے درویش عاشق، انشائیہ نگاری، چند ہم عصر، ابن الوقت اور اکبر ایک مطالعہ جیسے موضوعات پر تنقیدی مضامین قلمبند کیے، نگاہ اور نقطے کے حوالے سے مصنف اپنے تنقیدی نظریے کی وضاحت یوں کرتے ہیں، ''نگاہ: کائنات کی وسعتوں کے ادراک کا آلہ۔ نقطے: تفہیم کائنات کی اکائی، بصیرت کا راز، کائنات کے اسرار کی علامت۔ تنقید: نگاہ اور نقطے میں توازن کے ہر دم متغیر انداز کا پیمانہ''۔ اس کتاب کے زیادہ تر مضامین نفسیاتی تنقید کے ذیل میں آتے ہیں، نفسیاتی تنقید سے مصنف کو خصوصی دلچسپی ہے اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ۔

> ابھی تک میرے مطالعے کی حدود پھیل رہی ہیں اور مختلف علوم سے روشناسی کے مراحل ابھی طے نہیں ہوئے تاہم میرا جھکاو نفسیاتی تنقید کی طرف ہے، نفسیاتی تنقید کے آغاز میں میں نے فرائیڈ سے اثرات قبول کیے مگر مزید مطالع کے بعد جب یونگ تک آ پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ یونگ میں جو گہرائی ہے اس کے اجتماعی لاشعور کے تصور میں جو قوت ہے وہ فرائیڈ کے مقابلے میں کہیں گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ یونگ کے ساتھ میں نے "Anthropology" اور "mythology" کا بھی مطالعہ کیا جن سے مجھے علامات وغیرہ کی تفہیم میں مدد ملی (۶)

مصنف کی تنقیدی تحریروں میں فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر کے نظریات کا اثر نمایاں ہے وہ تنقید کو تحلیل نفسی، لاشعور، جنسی ارتقا، نرگسیت، اور اجتماعی و انفرادی نفسیات کے زاویوں سے پیش کرتے ہیں، ڈاکٹر سلیم اختر فن پارے کے معاشرتی، سماجی، مذہبی اور معاشی تجزیے کے ذریعے سے فنکار کی نفسیاتی اساس تک رسائی حاصل کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ادبی شخصیات پر لکھے گئے ان کے مقالات و مضامین ان کی اس خوبی کی دلیل

ہیں، مصنف نے فرائیڈ، یونگ اور ایڈلر کے علاوہ ہربرٹ ریڈ، لائنل ٹریلنگ، آئی اے رچرڈسن، ڈیوڈ ڈیشز، اور ماڈباڈکن کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے۔ چونکہ ان تمام مغربی ناقدین کا نقطہ نظر بھی نفسیاتی ہے اس لیے مصنف نے ان ناقدین کی تحریروں میں خصوصی دلچسپی لی ہے۔ اردو ناقدین میں انھیں احتشام حسین، عزیز احمد اور آل احمد سرور پسند ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی نفسیاتی نقاد نہیں ہے، ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی رویے کا دائرہء کار صرف نفسیاتی تنقید تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ تنقید کی تمام جہتوں سے بخوبی واقف ہیں اور اس میدان میں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، یہ الگ بات ہے کہ ان کا پسندیدہ تنقیدی موضوع نفسیاتی تنقید ہے۔

تنقیدی دبستان تنقید کے حوالے سے یہ ایک اہم کتاب ہے اس کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے تنقیدی دبستانوں کی وضاحت کے ساتھ ساتھ جدید تنقیدی مباحث پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے، یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۷۴ء میں مکتبہ عالیہ لاہور سے شائع ہوئی، اس کتاب میں مصنف نے تشریحی، سائنٹفک، تقابلی، رومانی، جمالیاتی، تاثراتی، تاریخی، عمرانی، نفسیاتی، مارکسی، ہیتی، اسلوبیاتی، اور ساختیاتی تنقید کے نام سے کل ۱۳ تنقیدی دبستان قائم کیے ہیں جن کی تشریح وتوضیح کے لیے مغربی ناقدین کی آرا اور نظریات کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے نقادوں پر ان دبستانوں کے عمومی اثرات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے، اس کتاب کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کی کئی جامعات میں اس کو بطور نصاب پڑھایا جاتا ہے، اپنی اس تصنیف میں ڈاکٹر سلیم اختر اپنے مجموعی تنقیدی نقطہ نظر کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> تنقید میں گفتگو کا بنیادی حوالہ تخلیق اور تخلیق کار ہی بنتا ہے اور اس سے مفر بھی نہیں مگر تنقید کا اصل منصب ''قصیدہ در مدح'' نہیں بلکہ تخلیقات کے حوالہ سے عہد، اس کی اقدار اور معائر کا مطالعہ بھی ہونا چاہیے اور اور اس امر کا یقین کہ تخلیق کار کس حد تک اپنے عہد کی اقدار اور معائر کا حامی یا باغی تھا۔ سماج میں وہ "Statusquo" کا قائل تھا یا "Nonconformist" تھا۔ کیا تخلیق اس کے عہد کی تفہیم کے لیے اشاریہ بن سکتی ہے اور کیا اس کی اپنی شخصیت اس تمام تخلیقی عمل کا حصہ بنتی ہے یا اس سے الگ اور لاتعلق رہتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر تنقید محض اشعار کی تشریح تک محدود رہ جاتی ہے اور نقاد اکتارہ بجانے والا! تنقید مکمل آکسٹرا ہے ایک ساز یا ایک لے یا ایک سر نہیں! منطق کی روشنی

میں دیکھیں تو تنقید کو استخراجی (انتباتی "Diductive" کے بجائے استقرائی "Inductive ہونا چاہیے، اول الذکر رویہ پر مبنی تنقید محض قواعد وضوابط، ماضی، مسلمات اور حوالوں کے دائرہ میں محبوس ہو کر رہ جائے گی جبکہ اس کے برعکس استقرائی رویہ پر مبنی تنقید میں آزادی اور جستجو کی پیدا کردہ لچک ہوگی اس لیے اس میں فتویٰ سازی کے برعکس رائے کا اظہار ہوگا۔ لہٰذا نقاد کو "Electic" ہونا چاہیے۔ یعنی ایک در کا ہو رہنے کی بجائے آزاد علمی جستجو کے لیے علوم کے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی لینا چاہیے۔(۷)

ڈاکٹر سلیم اختر ادب برائے زندگی کے نظریے کے بھی قائل ہیں اور ترقی پسند ادیبوں سے انہیں خصوصی لگاو ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں نفسیاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مارکسی، عمرانی، اور سماجی اثرات بھی نظر آتے ہیں، لیکن وہ ایسے مارکسی یا ترقی پسند نقادوں کے خلاف ہیں جو بعض اوقات حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور اپنے ایک مخصوص نظریے کے علاوہ دیگر تمام تنقیدی رویوں کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں، بطور نقاد افسانہ نگار ان کی تحریروں میں ایک معتدل سماجی شعور ملتا ہے۔ انسان کی زندگی میں کئی موڑ ایسے بھی آ جاتے ہیں جہاں پر اسے نا چاہتے ہوئے بھی حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے، ڈاکٹر سلیم اختر نے اس قسم کے مشکل حالات میں بھی اپنے نظریات اور جذبات واحساسات کو کسی نہ کسی صورت قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، خاص کر تنقید کے معاملے میں ان کا انداز دوٹوک اور سخت قسم کا ہوتا ہے اسی لیے اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اور اقبال کا نفسیاتی مطالعہ جیسی کتب پر معاصر ادیبوں اور مذہبی حلقوں نے ان کی پرزور مخالفت کی، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ میں مصنف نے پہلی مرتبہ اقبال کو حکیم الامت، اور مفکر اسلام کے بجائے ایک مرد کے روپ میں پیش کیا۔ ان کی تنقید پر مبنی کتب کی فہرست خاصی طویل ہے جن میں طبع زاد، مرتبہ اور تراجم شامل ہیں، تنقیدی کتب میں نگاہ اور نقطے، افسانہ: حقیقت سے علامت تک، ادب اور لاشعور، تنقیدی دبستان، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، اقبال اور ہمارے فکری زاویے تخلیق اور لاشعوری محرکات، ادب اور کلچر، شعور اور لاشعور کا شاعر: غالب، نفسیاتی تنقید، تنقید اور تاریخ ادب، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، نظر اور نظریہ اور تین بڑے نفسیات دان اہم ہیں۔

افسانہ: حقیقت سے علامت تک یہ کتاب اردو فکشن کی تنقید کا ایک اہم زینہ ہے اس کتاب میں اردو افسانے کے ارتقاء اور دیگر موضوعات پر بحث کی گئی ہے مصنف نے پہلی مرتبہ اردو افسانے کی روایت کی کڑیاں باغ و بہار میں تلاش کی گئی ہیں، اس کے علاوہ سید سجاد حیدر یلدرم کی رومانوی تحریروں کے پردے میں چھپی جنس نگاری اور میر تقی میر کی شاعری کے عشقیہ عناصر اور باغ و بہار کے درویشوں کے عشق کے تقابل جیسے موضوعات اس کتاب کا حصہ ہیں۔

ادب اور لاشعور یہ ڈاکٹر سلیم اختر کی پسندیدہ کتابوں میں سے ایک ہے اس کتاب کو ۱۹۷۶ء میں داؤد ادبی انعام بھی ملا، اس میں مسائل ادب، اصنافِ ادب، تنقید، زبان و بیان، تخلیقی محرکات، تخلیقی عمل میں ادب کی مقصدیت، ادب کے اخلاقی دائرے، اور ادب برائے حصولِ مسرت جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے ، مجموعی طور پر یہ کتاب اصنافِ ادب کے نفسیاتی مطالعے پر مبنی ہے۔

جوش کا نفسیاتی مطالعہ اس کتاب کا عنوان ایسا ہے کہ قاری کو دھوکہ ہونے لگ جاتا ہے کہ شاید یہ کتاب صرف جوش کے متعلق ہی ہے لیکن اس کتاب میں جوش کے علاوہ جمیل الدین عالی، مجید امجد، سرسید اور علامہ اقبال جیسی شخصیات کا نفسیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ مصنف نے دیگر موضوعات خصوصاً غالبیات اور اقبالیات سے متعلق بڑی مفید کتب تحریر کی ہیں، اقبالیات کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر نے عام رویتی انداز سے ہٹ کر اقبال کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے جسے ماہرینِ اقبالیات نے ان کی ان تنقیدی کاوشوں کو خاصی اہمیت دی ہے اقبال شناسی کے سلسلے میں، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، اقبال : شخصیت ، افکار و تصورات، اقبال اور ہمارے فکری روّیے ،اقبالیات کے نقوش ،اقبال ممدوحِ عالم ، ایران میں اقبال شناسی کی روایت، اہمیت کی حامل ہیں ان کتب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبال کی حیات اور فکر و فن کے ساتھ ساتھ ان کا نفسیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے یہ کتاب ۱۹۹۵ء میں مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کے زیر اہتمام کتابیاتِ ادبِ اردو کے سلسلے میں چوتھے نمبر پر شائع کی گئی اور اس میں ایک سو سولہ مضامین شامل ہیں یہ مضامین کتابوں کی رونمائی کی تقریبات ، مصنفین کی فرمائشوں اور تنقیدی جائزوں کے تحت قلمبند کیے گئے اس کتاب

کومختلف موضوعات کے تحت گیارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں، شاعری حصہ اول وحصہ دوئم، فکشن، تنقید، شخصیت، ڈرامہ، طنز ومزاح، سفرنامہ، کلچر، تاریخ، اور نصاب پر لکھی جانے والی اہم کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

مغرب میں نفسیاتی تنقید یہ کتاب ڈاکٹر سلیم اختر کے پی۔ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالہ بعنوان اردو تنقید کا نفسیاتی دبستان کے چنیدہ مواد پر مشتمل ہے اس کتاب کی اشاعت ۱۹۷۸ء میں مجلس ترقی ءادب لاہور کے زیر اہتمام ہوئی بعد ازاں سنگ میل پبلی کیشنز نے اس کتاب کو چھاپا، اس کتاب میں تین ابواب کے ذیل میں مغرب کے نفسیاتی ناقدین اوران کے مختلف نظریات، مثلاً تخلیق کی تحلیل نفسی، ادب اور نفسیات، شعور اور لاشعور، اور نفسیات اور ادب، نفسیات اور اخلاقیات، نفسیات اور لسانیات، وغیرہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

تخلیق اور لاشعوری محرکات اس کتاب میں ان کے پی۔ایچ۔ڈی کے تھیسس کے وہ مقالات بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو مجلس ترقی ءادب کی طرف سے اشاعت بعنوان مغرب میں نفسیاتی تنقید میں طوالت کی وجہ سے حذف کر دیے گئے تھے، یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز کی طرف سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان میں تحلیل نفسی اور ادب، علامات وغیرہ کا نفسیاتی مطالعہ، اور شعراء کا نفسیاتی مطالعہ کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

نفسیاتی تنقید ۱۹۸۶ء مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اس کتاب میں مصنف نے سات ابواب قائم کیے ہیں، ان ابواب کے تحت ڈاکٹر سلیم اختر نے مغربی نفسیاتی نقادوں، فرائیڈ، ژونگ، اور ایڈلر کے نظریات وتصورات کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں نفسیاتی تنقید کے آغاز وارتقاء سے متعلق مباحث کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے مرزا ہادی رسوا کو اردو کا اولین نفسیاتی نقاد قرار دیا ہے اس کے علاوہ اس کتاب میں مصنف نے نفسیاتی تنقید کے طریقہ کار، نفسیاتی تنقید کی عملی مثالوں اور اردو کے دیگر نفسیاتی نقادوں کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے، بعض ادیبوں اور شاعروں کا مختصر نفسیاتی مطالعہ بھی اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

تین بڑے نفسیات دان یہ کتاب ۱۹۹۴ء میں سنگ میل پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوئی مصنف کے تنقیدی نقطہ نظر کے حوالے سے یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے کیونکہ مصنف کی نفسیاتی تنقید پر ژونگ، ایڈلر اور

فرئیڈ کے نظریات کا گہرا اثر ہے اور اس کتاب میں مصنف نے انہی تین نفسیات دانوں کا جائزہ پیش کیا ہے، یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔

باب نمبر ا۔ سگمنڈ فرائیڈ:

فرائیڈ ایک عظیم انسان، فرائیڈ کا نفسیاتی مطالعہ، نظریات، جنس کی اہمیت، نظریہء خواب، اور تحلیل نفسی۔

باب نمبر ۲۔ کارل گستاؤ ژونگ:

کارل گستاؤ ژونگ۔ ایک خاکہ، نظریہء لاشعور، ثواب، نفس۔

باب نمبر ۳۔ الفریڈ ایڈلر:۔

الفریڈ ایڈلر۔ ایک مطالعہ، انفرادی نفسیات۔ ایک تعارف، شخصیت کی تکمیل، بچے کی نشونما، اعصابیت، نظریہء جنس، خواب

اقبال کا نفسیاتی مطالعہ ڈاکٹر سلیم اختر اقبالیات پر نصف درجن کے قریب کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں مرتبہ اور طبع زاد شامل ہیں، یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں مکتبہ عالیہ لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں علامہ اقبال کی شخصیت سے متعلق ہے اور دوسرے حصے میں ان علم وفن پر نفسیاتی تنقید کی روشنی میں بحث کی گئی ہے، اس موضوع کا بنیادی عنصر علامہ اقبال اور عطیہ فیضی کے خطوط ہیں، ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب میں اقبال سے متعلق بعض ناقدین کی غلط تاویلات کا پردہ بھی چاک کیا ہے، اس کتاب کی اشاعت پر مذہبی حلقوں اور اور اقبال کے معتقدوں میں کافی شور اٹھا کیوں کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبال کو پہلی مرتبہ عالم ااور فلسفی کے بجائے ایک انسان اور عام مرد کے روپ میں پیش کیا، مصنف کو خود بھی اقبال کے تقدس اور مقام و مرتبے کا احساس تھا اسی لیے انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے نہایت احتیاط سے کام لیا پھر بھی چونکہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کاوش تھی اس لیے اس کتاب کی اشاعت پر شدید ردِ عمل سامنے آیا۔

اقبال اور ہمارے فکری رویئے اس کتاب کی پہلی اشاعت سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۸۲ء میں ہوئی اور اس میں کل گیارہ مقالات شامل کیے گئے ہیں جنھیں مصنف نے دو حصوں، مفکرِ عالم، اور ممدوحِ عالم، میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصے میں وہ مضامین شامل ہیں جن میں اقبال کی شخصیت، علم وفن،

اساتذہ اقبال، اور مشرقی ادب میں اقبال شناسی کی روایت پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے حصے میں بین الاقوامی سطح پر اقبال شناسی کی رویت اور ان کی عظمت پر مبنی مقالات شامل ہیں۔

ایران میں اقبال شناسی یہ کتاب ۱۹۸۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیز اہتمام شائع ہوئی اس کتاب میں ایرانی اقبال شناسوں کے مختلف مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے یہ ان مضامین کا اردو ترجمہ ہے ،کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے اور دوسرے حصے میں مضامین اور تیسرے حصے میں ایرانی شعراء کا منظوم خراج عقیدت شامل ہے۔

شعور اور لاشعور کا شاعر غالب ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبالیات کی طرح غالبیات پر بھی کئی کتابیں لکھی ہیں ان کتابوں میں شعور اور لاشعور کا شاعر غالب سب سے اہم ہے، یہ کتاب ۱۹۸۴ء میں فیروز سنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئی ، اس کتاب میں ۱۰ مضامین ،شعور اور لاشعور کا شاعر: غالب ، غالب خطوط کے آئینے میں، غالب کی نرگسیت ،مردِ عاشق کی مثال: غالب، غالب کی شاعری میں جنس، غالب: آتش زیر پا، غالب: مکتب، غمِ دل میں، بیاض غالب کا تجزیاتی مطالعہ، غالب و چغتائی کے ذہنی رابطے، غالب اور رشک، شامل ہیں۔

اس کے علاوہ تخلیق ، تخلیقی شخصیات اور تنقید کے نام سے ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقیدی کلیات بھی ۱۹۸۹ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کی جانب سے شائع کی گئی اس کتاب کے بیشتر مضامین ان کی پہلے کی شائع شدہ تنقیدی کتب میں شامل رہے ہیں، اس کتاب کو کل آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اپنی تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر جلیل اشرف کے ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا ہے کہ۔

> بحیثیت نقاد میں اس بات کا قائل ہوں کہ اپنی بات کو دوٹوک انداز سے قطعی قسم کے اسلوب میں بیان کرنا چاہیے۔ مجھے الجھے ہوئے بیانات، غیرضروری حوالوں اور تکرار سے سخت چڑ ہے اور ایسے نقاد کو نہیں پڑھ سکتا۔ اگر آپ اس نقطہ نظر سے میرے اسلوب کا مطالعہ کریں تو اس میں آپ کو نہ تو تکرار ملے گی ، نہ غیر ضروری تفصیلات اور نہ ہی طرح طرح کے بے معنی حوالے اور آراء۔ اسلوب کی طرح میں رائے کے اظہار کو بھی دوٹوک بنانے کا قائل ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ گول مول الفاظ میں Non-Committle قسم

کی رائے کا اظہار اس بات کا غماز ہے کہ نقاد میں اعتماد نہیں اور وہ دوٹوک رائے کے خطرات مول لینے کو تیار نہیں ہے۔ تنقید اور بالخصوص معاصرین پر تنقید کمزور اعصاب والے نقادوں کا کام نہیں ہے۔ نقاد کو چاہیے کہ کھل کر بات کرے اور اختلافِ رائے کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے، مجھے پاکستان میں ایک متنازعہ فیہ ادیب سمجھا جاتا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ میں اچھی، بری، صحیح یا غلط جو بھی رائے ہو اس کا اظہار کر گزرتا ہوں۔(۸)

د۔ اغراض ومقاصد

اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی روایت آہستہ آہستہ مستحکم ہو رہی ہے تحقیق وتدقیق کا کام سائنسی انداز میں انجام دینے کا رجحان فروغ پا رہا ہے ادبی تاریخ نویسی کے جدید نظریات ورجحانات کے بل پر اور قدیم ماخذات کی چھان پھٹک سے تاریخی واقعات پر پڑی گرد رفتہ رفتہ صاف ہو رہی ہے اور ادبی شخصیات وتخلیقات کی تحقیق کے ضمن میں پیش رفت ہو رہی ہے، اردو ادب کے چار سو سالہ منظر نامے کی تفہیم وتشریح کے حوالے سے مورخینِ ادب کی خدمات قابلِ قدر ہیں، جن لوگوں نے ہمارے ادبی ورثے کو محفوظ کرنے اور اسے آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے اپنی عمریں خرچ کر دیں ان پر جواد علی زیدی کی طرح یہ الزام لگانا کہ ''آج تک اردو ادب کی تاریخ سرے سے لکھی ہی نہیں گئی'' سراسر ناانصافی ہے، کمی کوتاہی کا احتمال ہر انسانی کام میں موجود ہوتا ہے، لیکن کسی کی شب وروز کی محنت کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی صاحبِ علم سے تکمیلیت کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، اردو کے تذکرے ہوں، محمد حسین آزاد کی آبِ حیات، ہویا رام بابو سکسینہ کی، تاریخِ ادب اردو ہو یا اس کے بعد لکھی جانے والی تواریخ ہوں سب کی اہمیت مسلمہ ہے۔

ادبی تاریخ نویسی کے میدان میں ہمیں ہر طرح کی تواریخ ملتی ہیں انگریزی زبان میں لکھی ہوئی، اردو میں لکھی ہوئی بسیط ومختصر، شعراء کے احوال پر مبنی، نثر نگاروں کے بارے میں لکھی گئی تواریخ غرض مورخینِ ادبِ اردو نے ہر انداز میں اردو شعر وادب کی تفہیم کا سامان ہمارے لیے بہم پہنچایا، مختصر ادبی تواریخ میں ڈاکٹر سلیم اختر کی اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ منفرد مقام ومرتبے کی حامل تاریخ ہے، اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت جو دیگر ادبی تواریخ میں موجود نہیں ہے وہ یہ ہے کہ مصنف نے اس کتاب کو تا حال اپ ٹو ڈیٹ رکھا

ہے، سال بہ سال کے بدلتے ہوئے ادبی ماحول اور نت نئے نظریات ورجحانات اس کتاب میں جگہ پاتے رہتے ہیں، اس حوالے سے مصنف کی مسلسل کوششوں کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں یہ کتاب صرف ۲۵۰ صفحات پر مشتمل تھی اور اب اس کتاب میں صفحات کی تعداد ۷۰۰ سے تجاوز کر گئی ہے، ابتدا میں بعض موضوعات مثلاً انشائیہ، غالبیات اور اقبالیات کے بارے میں اس کتاب میں تفصیلات کا دائرہ کار محدود تھا لیکن بعد کے ایڈیشنوں میں اسی موضوع کے حوالے ہونے والی جدید تحقیق کے تمام مباحث اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد ادبی حلقوں خصوصاً اردو ادب کے طالب علموں نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہ کتاب بہت تیزی سے مقبول ہونے لگی، اس مقبولیت کے پیش نظر ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے اوپر عائد ہونے والی بھاری ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے کتاب کی تصحیح اور تحریف واضافت کا بیڑا اٹھایا اور تا حال یہ سلسلہ جاری ہے، کتاب کے چھٹے ایڈیشن میں مصنف اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' لکھتے وقت یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ کتاب اتنی مقبولیت حاصل کر لے گی لیکن گزشتہ سات برس میں اس کے پانچ ایڈیشن چھپے اور بکے! جہاں یہ میرے لیے باعثِ عزت تھا وہاں اس امر کا غماز بھی کہ عام عام قاری کی ضروریات کے لیے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو انھیں کیپسول میں ضروری معلومات فراہم کرے ۔آج جب کہ اردو کی چھوٹی بڑی اہم اور غیر اہم ادبی تواریخ کم از کم چالیس پچاس سال قبل کی ہیں تو ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کی صورت میں ایک ایسی کتاب بھی تھی جو سالِ اشاعت ۱۹۷۱ء تک اپ ٹو ڈیٹ تھی اور اس کے ہر نئے ایڈیشن میں ضمیموں کے اضافہ سے گزری مدت کی اہم کتابوں اور شخصیات کے تذکروں سے کتاب مزید اپ ٹو ڈیٹ بنتی رہی اور اب یہ چھٹا ایڈیشن مکمل طور پر نظر ثانی کے بعد پیش کیا جا رہا ہے یہی نہیں بلکہ ابواب کی ترتیب زیادہ بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ نئے مواد کی روشنی میں ہر باب کو زیادہ مفصل بنانے کی کوشش کی گئی ہے ۔(۹)

اس کتاب کو لکھتے وقت مصنف کے ذہن میں یہ بات نہ تھی کہ یہ کتاب اردو ادب کے طلبہ اور اساتذہ

کے لیے کتنی سود مند ثابت ہو سکتی ہے، لیکن اس کتاب نے جلد ہی طلبہ اور اساتذہ میں مقبولیت حاصل کر لی۔

ح۔ مسائل و مشکلات

چونکہ ڈاکٹر سلیم اختر بنیادی طور پر نقاد ہیں اور تحقیق خصوصاً ادبی تاریخ لکھنا ان کے لیے آسان نہ تھا، اس کے بعد کتاب کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کے بارے میں ادبی حلقوں میں پیدا ہونے والی نزاعی صورتِ حال نے بھی مصنف کے لیے مشکل پیدا کر دی جہاں اس کتاب کو پذیرائی حاصل ہوئی وہیں اس کتاب پر اعتراضات کی بھی بوچھاڑ ہوئی، مصنف نے کتاب پر کیے جانے والے ان جملہ اعتراضات کو ذاتی نوعیت کے اعتراضات قرار دیا ہے، مصنف کے بقول معاصر ادیب کتاب میں اپنا تذکرہ نہ ہونے یا اپنے مخالفین کے تذکرے کی موجودگی کی وجہ سے ان کے مخالف ہو گئے اور انھیں خطوط میں دھمکیاں دیں، اخباری کالموں میں ان پر کیچڑ اچھالا، سفارشوں کے ذریعے اپنا نام کتاب میں شامل کرانے کی کوششیں کیں اور بعض لوگوں نے عملی طور پر انھیں نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کی، کچھ اور نزاعی مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے مصنف کتابِ مذکور میں لکھتے ہیں۔

> کتاب کے حوالے سے درِ نزاع وا ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ (ابتدائی چھ ایڈیشنوں تک) جہاں ناموں اور کتابوں کے اضافوں سے کتاب کو اپ ٹو ڈیٹ کیا وہاں بعض اسماء کے اخراج سے بھی کتاب کو اپ ٹو ڈیٹ بنانے کی سعی کی تاریخ ادب کو۔۔۔ مثبت اور منفی طریقہ۔۔۔ ہر دو لحاظ سے اپ ٹو ڈیٹ بنائے رکھنے کا یہ تجربہ کہاں تک سود مند ثابت ہوا؟ گالیوں کی بوچھاڑ سے تو لگتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ کامیاب رہا۔ میں ذاتی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ ادبی مورخ کے لیے اچھا ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا آڈیٹر ہونا بھی ضروری ہے اس سے تخلیق کاروں اور تخلیقات کی بیلنس شیٹ متوازن رہ سکتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ تاریخ کی قلم رو سے جو جلا وطن ہوا وہ گالیاں تو دے گا لہٰذا معاصرین پر قلم اٹھانا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ آپ مجھے اور کسی بات کا کریڈٹ مت دیں مگر بقائمی ہوش و ہواس اور بلا جبر و استکراہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی داد تو دیں۔ (۱۰)

سنین کے اندراج کا مسئلہ بھی اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی روایت میں ہمیشہ سے متنازعہ رہا ہے مورخین ادب وقوعات وشخصیات اور کتابیات کے حوالے سے کسی ایک سن پر متفق نہیں ہوتے ،ڈاکٹر سلیم اختر نے اس مسئلے کا حل یوں نکالا ہے کہ جس سن پر محققین کی اکثریت کا اتفاق پایا اسی کو مستند مان کر درج کر دیا، یا محققین کی تحقیقات سامنے رکھ کر فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا۔حتیٰ الامکان ہجری اور عیسوی دونوں سنین دینے کی کوشش کی۔

۵۔ تکمیل وطباعت

ڈاکٹر سلیم اختر نے ۱۹۶۲ء میں ایمرسن کالج ملتان میں بطور اردو لیکچرر جوائنگ دی اور آٹھ سال تک وہاں پر درس وتدریس کی خدمات سرانجام دیتے رہے، ملتان کی ذرخیز ادبی فضا میں ان کے جوہر کھل کر سامنے آئے یہی پر انھوں نے افسانہ نویسی ،اور تحقیق وتنقید کے سلسلے میں اپنی بھرپور کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور تنقیدی دبستان اور اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ جیسی کتب کی داغ بیل ڈالی اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کی تصنیف کے سلسلے میں ایک اہم وقوعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر سلیم اختر کے ملتان میں قیام کے دوران نیشنل بک سنٹر ملتان کے ماہنامہ رسالے ''کتاب کے مدیر سید قاسم محمود نے رسالے میں اردو اب کی تاریخ کو مختصراً عام قارئین کے لیے پیش کرنے کا منصوبہ بنایا تا کہ مجلّہ کے قارئین اردو کی ادبی تاریخ کا مختصر احوال جان سکیں اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے ڈاکٹر سلیم اختر کا انتخاب کیا مصنف کے بقول یہ کام ان کی آزادانہ طبیعت کے موافق نہ تھا لیکن انھوں نے اردو کی ادبی تاریخ لکھنے کے لیے خود کو تیار کر لیا اور یوں انھوں نے ماہنامہ کتاب کے لیے ادبی تاریخ لکھنا شروع کر دی یہ تاریخ ۱۲ اقساط میں رسالے میں چھپی، ۱۹۷۱ء میں جب مصنف لاہور آئے تو انھوں نے اس مسودے میں کانٹ چھانٹ اور ترمیم واضافے کے بعد اسے کتابی شکل دے دی اور یہ کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے نام سے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی ۔اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کو ۴۶ سال ہو گئے اور کتاب کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے، کتاب کی مقبولیت کی وجہ مصنف کی مسلسل محنت ہے جو انھوں نے اس کتاب کی نوک پلک سنوارنے میں کی ، ۴۶ سال کی اس جدوجہد کا خلاصہ مصنف نے یوں پیش کیا ہے۔

> جب ۱۹۶۸ء میں ملتان میں اس کتاب کا ڈول ڈالا تو میں جوان تھا۔آج یہ سطریں لکھتے
> وقت ۷۸ برس کا ہو چکا ہوں، عمر اس کتاب کے بنانے سنوارنے میں صرف ہوئی ۔ یوں

کہ اس عمل میں خود بھی خرچ ہو گیا۔(۱۱)

بلا شبہ اس کتاب پر کی گئی مصنف کی محنت قابل ستائش ہے اور اس کا ثمرہ اس کتاب کے حالیہ ایڈیشن کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، گو کہ یہ کتاب اب مختصر ترین نہ رہی لیکن اب اس کتاب کا شمار اردو ادب کی مستند ترین تواریخ میں کیا جا سکتا ہے جو کہ اردو کی ادبی تاریخ کے حوالے سے تمام اہم شخصیات، تخلیقات، وقوعات، اصناف، اور قدیم و جدید نظریات و مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشانِ جگر سوختہ (آپ بیتی)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۲۔

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشانِ جگر سوختہ، ایضاً، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۴۔

۳۔ جاوید اقبال ندیم، ذوقِ سلیم، مرتبہ، ایضاً، ۲۰۰۲ء، ص ۶۹۔

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ساتواں ایڈیشن، ایضاً، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲

۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، ایضاً، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱، ۱۲۔

۶۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ہمسفر بگولوں کا، الفیصل تاجران اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۵۷۔

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵، ۱۶۔

۸۔ جلیل اشرف، ڈاکٹر، ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت نقاد، ایضاً، ۲۰۰۹ء، ص ۷۰، ۷۱۔

۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، چھٹا ایڈیشن، ایضاً، ۱۹۸۰ء، ص ۱۱۔

۱۰۔ ایضاً، تیسواں ایڈیشن، ایضاً، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲۔

۱۱۔ ایضاً، تیسواں ایڈیشن، ص ۱۴۔

باب سوم

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: تحقیقی جائزہ

ا۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: آغاز وارتقاء

ب۔ ادبی وعلمی ضرورت واہمیت

ج۔ کتابیات وماخذات

د۔ اول وآخر طباعتوں کا تقابلی جائزہ

ہ۔ سنین کے اندراج کا مسئلہ

ر۔ محققین کی آراء

ح۔ ابواب بندی

ی۔ ڈاکٹر سلیم اختر بطور محقق

تیسرا باب

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ،، تحقیقی جائزہ

ا۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: آغاز وارتقاء:

ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھنے لکھانے کا کام بچپن سے ہی شروع کر دیا تھا اردو اب کے مشہور شاعر عبدالحمید عدم ان کے والد کے دوست تھے سلیم اختر اکثر اپنے والد کے ہمراہ عدم سے ملتے اور انہیں کی صحبت کے زیر اثر انھوں نے شعر وشاعری کا آغاز کر دیا، تخلص انجان رکھا اور عبدالحمید عدم سے اصلاح لینے لگے لیکن یہ سلسلہ تا دیر نہ چل سکا، اس کے بعد انھوں ۱۹۴۶ء میں بچوں کے ایک رسالے ''تعلیم وتربیت'' کے لیے ایک کہانی ''ایماندار مصور'' لکھی اس وقت ڈاکٹر سلیم اختر انبالہ مسلم ہائی سکول میں چھٹی جماعت کے طالب علم تھے، آٹھویں جماعت میں لاہور کے ایک فلمی رسالے کے لیے دو افسانے ''قربانی'' اور ''ساحرہ'' کے نام سے لکھے۔ اسی دوران سلیم اختر نے بچوں کی کہانیوں پر مشتمل دو کتابیں بھی لکھیں اور علامہ اقبال اور میر تقی میر پر مضامین بھی لکھے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی ادبی شخصیت میں نکھار اس وقت پیدا ہونے لگا جب وہ ایمرسن کالج ملتان میں بطور اردو لیکچرر تعینات ہوئے ملتان کی اس وقت کی ادبی فضا میں ان کے تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی جوہر کھل کر سامنے آئے، ان کی پہلی تنقیدی کتاب نگاہ اور نقطے اسی زمانے میں منظر عام پر آئی، اور اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کی بنیاد بھی اسی زمانے میں پڑی، اس کتاب کا اصل منصوبہ نیشنل بک کونسل کے مدیر ''سید محمود قاسم'' نے بنایا، وہ نیشنل بک کونسل کے ماہنامہ رسالے ''کتاب'' میں اردو ادب کی تاریخ کو مختصراً قارئین کے لیے پیش کرنا چاہتے تھے تا کہ عام قاری بھی سہولت کے ساتھ اردو ادب کی تاریخ سے واقفیت حاصل کر سکے ان دنوں سید محمود قاسم ٹوکیو میں مقیم تھے انھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے بذریعہ خط ڈاکٹر سلیم اختر سے رجوع کیا، لیکن ان کی طبیعت فطری طور پر تاریخ نویسی کی طرف مائل نہ تھی اس لیے اس کام کو کرنے کے لیے انھیں اپنے آپ کو جبراً تیار کرنا، پڑا اس بابت اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔

> میں نے اس کام کی حامی تو بھر لی لیکن ذہن الجھا الجھا رہا اس لیے کہ میں نے آج تک جو بھی لکھا من کی موج سے لکھا اس لیے لکھنے میں کسی طرح کی بھی منصوبہ بندی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، لیکن اب معاملہ انفرادی نوعیت کے مضامین کا نہ تھا بلکہ اردو ادب کی تمام تاریخ لکھنے کا تھا اور وہ بھی مختصر ترین۔ لیکن مختصر ترین کا مطلب سرسری بنانا نہ تھا اور میرا اپنا مزاج بھی ادبی مورخ کا نہیں!۔(۱)

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ادبی تاریخ نویسی کا کام ڈاکٹر سلیم اختر کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھا اس لیے ابتدائی ایڈیشنوں میں موضوعات کے حوالے سے اگر تشنگی پائی گئی تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ یہ ایک تجرباتی مرحلہ تھا جو کہ طے ہو چکا ہے، مصنف کو خود بھی اس بات کا احساس تھا اسی لیے بعد کے ایڈیشنوں میں مسلسل کتاب کو مربوط بنانے کی کوشش کرتے رہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے ابتدائی میں بارہ اقساط پر مشتمل اردو کی ادبی تاریخ کا ایک خاکہ تیار کر کے سید محمود قاسم کو ٹوکیو بھیجا بعد ازاں ان کی وطن واپسی پر مارچ ۱۹۶۹ء میں اس سلسلے کی پہلی قسط رسالہ ''کتاب'' میں شائع ہوئی اس رسالے میں اردو ادب کی تاریخ کو کل ۱۲ اقساط میں سمیٹا گیا، جب ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر سلیم اختر کا تبادلہ لاہور ہوا تو انھوں نے ادبی تاریخ کے اس مسودے کو تحریف و اضافت کے بعد باقاعدہ کتابی شکل دے دی اور ۱۹۷۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے یہ کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے نام سے شائع ہوئی اس ابتدائی ایڈیشن میں مصنف نے اردو کی ادبی تاریخ کے کل چودہ ابواب قائم کیے اور اردو ادب کے آغاز سے ۱۹۷۱ء تک کا مختصر جائزہ پیش کیا، سنگ میل پبلی کیشنز کے مالک نیاز احمد مرحوم کی مصنف اور کتاب کے بارے میں یہ مختصر سی آراء بھی اس ایڈیشن میں کتاب کا حصہ ہے۔

> مشہور نقاد سلیم اختر کی تازہ تصنیف ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' پیش کرتے ہوئے بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اردو ادب کی ایک جامع اور مکمل تاریخ ہے، جس میں غیر ضروری طوالت پسندی سے احتراز برتا گیا ہے۔ مولف نے مباحث و شواہد کو بڑے سلیقے اور قرینے سے پیش کیا ہے۔ کتاب کا اجمال دریا کو کوزے میں بند کرنے کی عمدہ مثال

ہے۔۔۔۔ یہ کتاب آغاز سے لے کر ۱۹۷۱ء تک کے اردو ادب کے سفر کی ایک مجمل سی داستان پر مشتمل ہے اس کے باوجود یہ زبان و ادبِ اردو کے طالب علم کے ذوق کو پورا کرنے کی کامل صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ (۲)

ابتدائی ایڈیشن میں اس کتاب کی کل ایک ہزار کاپیاں شائع کی گئیں اور قیمت اس وقت آٹھ روپے رکھی گئی اس ایڈیشن میں کتاب کل ۲۵۶ صفحات پر مشتمل تھی اور اس کی کتابیات کی تعداد مع جرائد ۷۹ تھی ، اس ایڈیشن میں کتاب کے آخر میں مصنف کا مختصر سا تعارف بھی شامل تھا، مصنف نے اس اولین ایڈیشن کا انتساب سید محمود قاسم کے نام کیا، ایک مختصر سا پیش لفظ اس میں شامل کیا گیا جس میں مصنف نے کتاب کے آغاز وارتقاء، عنوان، اور ابواب بندی اور کتاب کی اشاعت ومنصوبہ بندی کے متعلق معلومات درج کیں، اس وقت یہ کتاب اردو ادب کے آغاز سے ۱۹۷۱ء تک کے منظر نامے پر مشتمل تھی کتاب کے ابواب کچھ یوں ترتیب دیے گئے۔

باب نمبر ۱: اردو ہے جس کا نام۔

باب نمبر ۲: آغاز کے بارے میں نظریات۔

باب نمبر ۳: جنوبی ہند میں اردو ادب۔

باب نمبر ۴: شمالی ہند میں اردو ادب۔

باب نمبر ۵: لکھنو کا دبستان شاعری۔

باب نمبر ۶: فورٹ ولیم کالج اور اردو نثر کا ظہور۔

باب نمبر ۷: دہلی کے نامور شعراء۔

باب نمبر ۸: سرسید تحریک اور ادبی نشاۃ ثانیہ۔

باب نمبر ۹: عبوری دور کا ادب۔

باب نمبر ۱۰: ترقی پسند ادب کی تحریک۔

باب نمبر ۱۱: محرم رازِ درونِ میخانہ: اقبال۔

باب نمبر۱۲: اردو ڈرامہ۔

باب نمبر۱۳: پاکستان میں ادب کا جائزہ۔

باب نمبر۱۴: پاکستان میں ادبی تجربات اور نئے رجحانات۔

کتاب کے ابتدائی ایڈیشن کی اشاعت کے ساتھ ہی اس کی مقبولیت کا آغاز ہوا اور آنے والے ہر سال دو سال میں اس کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کرنا پڑا ۱۹۸۱ء میں اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ مصنف اس کتاب میں ہر نئے ایڈیشن کے ساتھ ضروری معلومات اور نئے ادبی رجحانات کی تفصیلات شامل کرتے رہے ۱۹۸۱ء کے ساتویں ایڈیشن میں ایک ضمیمہ ''۱۹۸۰ء میں تخلیقی نثر'' کے عنوان سے کتاب میں شامل کیا گیا جس میں افسانہ، ناول، طنز و مزاح اور سفر ناموں کے حوالے سے نئی اور مفید معلومات کا اضافہ کر دیا گیا۔ اسی سال شائع ہونے والے آٹھویں ایڈیشن میں بھی ایک ضمیمہ ''۸۱ء۔۱۹۸۰ء کی اہم کتابیں'' کے نام سے شامل کیا گیا جس میں تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی کتابیات کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ کچھ نئے شعراء کے کلام کا نمونہ بھی دیا گیا۔ ۱۹۸۳ء اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا نواں ایڈیشن شائع ہوا جس میں ایک ضمیمہ ''۸۲ء۔ ۱۹۸۱ء کی اہم مطبوعات'' کے نام سے شامل کیا گیا جس میں ۲۸ء۔۱۹۸۱ء کی اہم ادبی تصانیف کی تفصیلات کا احاطہ کیا گیا۔

۱۹۸۶ء میں جب اس کتاب کا گیارہواں ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں بھی ایک ضمیمہ ''۸۵۔۱۹۸۳ء کی منتخب کتابیں'' نے نام سے شامل کیا گیا، ۱۹۹۹ء کے بعد ضمیموں کی بجائے نئے ابواب میں مختلف ادبی موضوعات پر مشتمل معلومات وضاحت کے ساتھ درج کی گئیں، لیکن ضمیمہ جات کی تفصیلات بھی برقرار رہیں، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ یہ کتاب ابتدا میں کل چودہ ابواب پر مشتمل تھی لیکن اب جب کہ اس کتاب کا تیسواں ایڈیشن ۲۰۱۲ء شائع ہو چکا ہے تو اس نئے ایڈیشن میں کل ابواب کی تعداد اُنتیس تک جا پہنچی ہے اور صفحات کی تعداد ۲۰۷ ہوگئی ہے۔ اس نئے ایڈیشن کے پیش لفظ میں ڈاکٹر سلیم اختر اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اور اپنی مسلسل جدوجہد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> جہاں تک موجودہ ایڈیشن کا تعلق ہے تو اس ضمن میں عرض ہے کہ اس میں ۵ نئے ابواب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ''زبان: قومی اور بین الاقوامی تناظر''، ''اردو صحافت اور ادبی جرائد''،

''جوہر عورت کی نمود''''ظرافت کا لحاف ۔۔میڈ ان پاکستان''، اور''پنجاب میں اردو ادب''۔ان نئے ابواب کے علاوہ نئی معلومات، مواد اور کوائف کی صورت میں تاریخ کو اپ ٹو ڈیٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔حسبِ ضرورت بعض شخصیات اور اصناف کے ضمن میں کتابیات بھی درج کر دی ہیں۔ جب ۱۹۶۸ء میں ملتان میں کتاب کا ڈول ڈالا تو میں جوان تھا۔آج یہ سطریں لکھتے وقت میں ۷۸ برس کا ہو چکا ہوں، عمر اس کتاب کے بنانے سنوارنے میں صرف ہوئی ۔ یوں کہ اس عمل میں خود بھی خرچ ہو گیا۔ جب ۲۰۰۰ء میں اس کا انیسواں ایڈیشن با اندازِ نو شائع ہوا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو کام ختم ہوا مگر نیاز احمد مسلسل اصرار کرتے رہے کہ مزید اضافوں کے ساتھ کتاب کا نیا ایڈیشن تیار کرو۔گرتی صحت کی وجہ سے مجھ میں مزید محنت کی سکت نہ تھی۔ بہر حال شکستہ ہمت جمع کی اور کام میں جت گیا تا کہ صحت کی مزید خرابی سے پہلے ہی کام سمٹ جائے۔(۳)

یوں ڈاکٹر سلیم اختر کی عمر بھر کی ریاضت اور جانفشانی کا ثمرہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کی صورت میں ہم تک پہنچتا ہے جو اب ایک مربوط اور بسیط تاریخ کی صورت میں ادبی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کر چکی ہے۔

ب۔ ادبی و علمی ضرورت و اہمیت

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں مصنف اردو ادب اور عالمی ادبی نظریات و رجحانات کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے منظر نامے کی تفصیلات شامل کرتے رہتے ہیں، اردو ادب کی دیگر تواریخ میں کسی مخصوص عہد تک کے ادب کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے اور ادبی میدان میں منظر عام پر آنے والی جدید تحقیقات اور تخلیقات کا احاطہ نہیں کیا جاتا ایسے میں ادب کے قاری کی علمی ضروریات کا دامن تشنہ رہ جاتا ہے اور پرانی تحقیقات اور مواد پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے یا پھر معلومات کے حصول کے لیے ادب کے قاری اور طالب علم کو ادبی تواریخ کے ساتھ ساتھ کئی ایک دیگر کتابوں کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا ہے، ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی تاریخ کو اپ ٹو ڈیٹ رکھ کر ادب کے قاری کی اس مشکل کو آسان کر دیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب تاریخ ادبِ اردو میں براہ راست قدیم ماخذات تک رسائی حاصل کر کے ان کی چھان پھٹک کا طریقہ کار اپنایا ہے ایسے میں انھیں مختلف موضوعات کا احاطہ تفصیلی مباحث کے ساتھ کرنا پڑا جب کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے قدیم ماخذات تک براہ راست رسائی حاصل کرنے کے بجائے ادبِ اردو کے مختلف محققین کی تحقیقات و نظریات کی چھان پھٹک سے کام لیا ہے اور سہولت اور اختصار کے ساتھ ادبی معلومات کو ایک ہی جلد کی اس کتاب میں سمو دیا، اس کتاب کے ابتدائی زمانے میں ڈاکٹر سلیم اختر ادبی تاریخ نویسی کے فن سے قدرے نا آشنا تھے اور ان کی طبیعت بھی اس طرف مائل نہ تھی اس پر ''مختصر ترین'' کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے انھوں نے کئی اہم موضوعات کو انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کیا جس کی وجہ سے اس کتاب میں تشنگی پائی گئی اور اعتراضات بھی ہوئے لیکن اب اس کتاب میں معلومات و تحقیقات کا دامن کافی وسیع ہو چکا ہے گو کہ اس کے نام کے ساتھ اب بھی ''مختصر ترین'' کے الفاظ موجود ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب یہ کتاب مختصر ترین نہیں رہی بلکہ ایک بسیط اور مربوط ادبی تاریخ بن چکی ہے۔

کتاب میں موجود ایسے پرانے مباحث جو ادھورے محسوس ہوتے تھے اب مصنف کی توجہ اور محنت کی بدولت مکمل صورت میں کتاب کا حصہ ہیں، مثال کے طور پر غالبیات کے ضمن میں مصنف نے ابتدائی ایڈیشنوں میں جو معلومات دی تھیں ان میں اب خاطر خواہ اضافہ کر دیا ہے، جدید و قدیم تحقیقی مواد سے استفادہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے غالب کی شخصیت اور ان کے فن پر بھر پور روشنی ڈالی ہے، غالب کے دواوین کی اشاعت، ترتیب، حالاتِ زندگی، غالب کے اشعار اور غزلوں کی تعداد، مختلف زبانوں میں غالب کے کلام کے تراجم، غالبیات کے موضوع پر لکھی جانے والی قدیم و جدید کتب، مصور دواوین، یہاں تک کہ پاکستان میں مختلف اداروں کی جانب سے غالبیات کے موضوع پر چھاپے جانے والے کیلنڈروں تک کی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہوئے غالب کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر پڑنے والے سماجی سیاسی، معاشی اور معاشرتی اثرات کا جائزہ نفسیاتی تنقید کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

اسی طرح اقبالیات کے باب ''محرم رازِ درونِ میخانہ'' میں ابتدائی ایڈیشنوں کی نسبت حالیہ ایڈیشن میں خاصی تفصیل کے ساتھ معلومات فراہم کی گئی ہیں، اس باب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اقبال کے حالاتِ زندگی اور

اور ان کے فن پر کی جانے والی قدیم و جدید تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے اقبال کی شخصیت، خانگی زندگی، سیاست، علم و فن، مزاج، روزگار، آمدنی، اور سید تقی عابدی کی کتاب ''چوں مرگ آید'' کے حوالے سے اقبال کی بیماریوں اور ان کی وجوہات تک کی تفصیلات فراہم کی ہیں، مذکورہ بالا تحقیقی مواد کی روشنی میں اس بات کا اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہ ہوگا کہ مصنف نے اپنے اختصار میں اردو ادب کی جامعیت کو کس احسن انداز میں سمویا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت میں بھی یہ کتاب عام قارئین اور اردو ادب کے طالب علموں میں مقبول ہے، ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب میں مختلف موضوعات اور نظریات کی وضاحت کے لیے گراف اور نقشوں کی مدد بھی فراہم کی ہے اس ضمن میں اقبال کے فکر و فلسفہ اور ان کے شجرہ نسب، ہندوستانی زبانوں اور نظم و نثر کے گراف وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں، فورٹ ولیم کالج کے حوالے سے ڈاکٹر گلکرسٹ اور فورٹ ولیم کالج کی کتب کے متعلق متعدد معلومات کا اضافہ کر دیا گیا ہے، مجموعی طور پر اس کتاب کا جائزہ لیا جائے تو اس کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کتاب کو مصنف نے ایک ایسے مخصوص وضاحتی انداز میں ترتیب دیا ہے کہ قاری بڑی سہولت کے ساتھ ادبی نزاعات اور وقوعات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔

ج۔ کتابیات و ماخذات:

مولانا محمد حسین آزاد کا تذکرہ آبِ حیات اردو ادب کی تاریخ نویسی کی روایت میں ایک اہم ماخذ تصور کیا جاتا ہے کم و بیش اردو ادب کا ہر مؤرخ اس تذکرے سے استفادہ کرتا ہے، اردو تذکروں کی روایت میں اس تذکرے کو سب سے زیادہ معتبر مانا جاتا ہے ایسے میں ادبی مورخین کا اس تذکرے کی طرف رجوع کرنا فطری سا امر ہے، ڈاکٹر سلیم اختر نے گو کہ اختصار کی خاطر قدیم ماخذات کی طرف بہت کم رجوع کیا ہے لیکن ''آبِ حیات'' کو انھوں نے بھی کتابیات کی فہرست میں پہلے نمبر پر رکھا ہے، مصنف نے اردو ادب کی تحقیقی، تنقیدی، اور بعض تخلیقی کتب و رسائل سے استفادہ کرتے ہوئے معتبر اور مختصر مواد اکھٹا کیا ہے، کتاب کے مواد کی جمع آوری کے لیے مصنف نے کل ۱۶۳ کتابوں کا مطالعہ کیا، اور بے شمار تحقیقی و تنقیدی مضامین جو مختلف ادبی رسائل و اخبارات میں چھپے یا کانفرنسوں میں پڑھے گئے مصنف کے زیر مطالعہ رہے، اس کے علاوہ ان کی عمر بھر کی تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی ریاضت بھی اس کتاب کی تکمیل میں معاون و مددگار رہی۔ ''آبِ حیات'' کے علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ان میں سے چند اہم کتابیں درج ذیل ہیں۔

☆ نکات الشعراء ۔۔۔۔میر تقی میر۔

☆ دبستانِ لکھنو کے داستانی ادب کا ارتقاء۔۔۔۔ڈاکٹر آغا سہیل۔

☆ داستان کی داستان۔۔۔۔آرزو چودھری۔

☆ اردو کے اہم ڈرامہ نگار (مقدمین)۔۔۔۔ابراہیم یوسف۔

☆ واقعاتِ انیس۔۔۔۔میر مہدی حسن احسن لکھنوی۔

☆ غالبِ پریشاں۔۔۔۔انیس ناگی۔

☆ اردو سٹیج ڈرامہ۔۔۔۔اے۔بی اشرف۔

☆ منشوراتِ کیفیہ۔۔۔۔برجموہن دتاتریہ کیفی۔

☆ اردو کا کلاسیکی ڈرامہ۔۔۔۔امتیاز علی تاج۔

☆ تاریخِ ادبِ اردو(جلد اول)۔۔۔۔ڈاکٹر جمیل جالبی۔

☆ مقدمہ شعر و شاعری۔۔۔۔مولانہ الطاف حسین حالی۔

☆ تاریخ ادبِ اردو۔۔۔۔رام بابو سکسینہ۔

☆ تلاش و تعبیر۔۔۔۔رشید حسن خان۔

☆ اردو نثر کا آغاز و ارتقاء۔۔۔۔ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

☆ ہندوستانی لسانیات۔۔۔۔ڈاکٹر محی الدین قاری زور۔

☆ اردو کا روپ۔۔۔۔ڈاکٹر سہیل بخاری۔

☆ موازنہ انیس و دبیر۔۔۔۔مولانہ شبلی نعمانی۔

☆ اردو قواعد ، اردو لسانیات۔۔۔۔شوکت سبزواری۔

☆ اردو زبان کا ارتقاء ۔۔۔شوکت سبزواری۔

☆ اردو کے یورپین شعراء ۔۔۔شفقت رضوی۔

☆ اردوئے قدیم ۔۔۔شمس اللہ قادری۔

☆ اردو کی ابتدائی نشو نما میں صوفیا کرام کا کردار ۔۔۔مولوی عبدالحق۔

☆ سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ ۔۔۔سید عبداللہ۔

☆ شعر الہند ۔۔۔عبدالسلام ندوی۔

☆ اردو کی منظوم داستانیں ۔۔۔فرمان فتح پوری۔

☆ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ۔۔۔فرمان فتح پوری۔

☆ اردو کی نثری داستانیں ۔۔۔ڈاکٹر گیان چند جین۔

☆ گلکرسٹ اور اس کا عہد ۔۔۔محمد عتیق صدیقی۔

☆ پنجاب میں اردو ۔۔۔مولانہ حافظ محمود شیرانی۔

☆ مقدمہ تاریخ زبان اردو ۔۔۔مسعود حسین خان۔

☆ دکن میں اردو ۔۔۔نصیر الدین ہاشمی۔

☆ دلی کا دبستان شاعری ۔۔۔نورالحسن ہاشمی۔

☆ ہماری داستانیں ۔۔۔سید وقار عظیم۔

☆ شاہان اودھ کے کتب خانے ۔۔۔محمد اکرام چغتائی۔

☆ ترقی پسند ادب : پچاس سالہ سفر ۔۔۔قمر رئیس، عاشور کاظمی۔

☆ انجمن پنجاب : تاریخ و خدمات ۔۔۔صفیہ بانو۔

☆ آثار الصنادید۔۔۔۔سرسید احمد خاں۔

☆ نقوشِ سلیمانی۔۔۔۔سید سلیمان ندوی۔

کتابیات کی فہرست میں ڈاکٹر سلیم اختر نے صرف تین تذکروں، آب حیات، نکات الشعراء، اور شعر الہند کے نام دیئے ہیں اس کے علاوہ کلاسیکی ادب کی تخلیقات کے بھی چند ایک ہی نام ہیں اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے کلاسیکی ادب پر قلمبند کی جانے والی تحقیقی وتنقیدی تصانیف سے زیادہ استفادہ کیا ہے، اس کے علاوہ بعض ایسی تحقیقی کتب بھی ہیں جن سے ڈاکٹر سلیم اختر نے کتاب کے لیے مواد حاصل کیا ہے اور ابواب میں مختلف موضوعات کی تفصیلات میں یا پھر ہر باب کے آخر میں حواشی کے ذیل میں ان کتابوں کے حوالے موجود ہیں لیکن کتابیات کی فہرست میں ان کے نام شامل نہیں ہوئے۔ اس کی ایک مثال سید تقی عابدی کی ''چوں مرگ آید'' ہے اسی طرح کتابیات کی فہرست میں ان اخبارات ورسائل کے نام نہیں دیے گئے جن سے کتاب کا مواد لیا گیا، بعض جرائد واخبارات کا ذکر بھی متن کے اندر ہی ملتا ہے۔

د۔ اول وآخر طباعتوں کا تقابلی جائزہ:

۱۹۷۱ء کے بعد مسلسل اشاعت اور تحریف واضافت کے عمل سے گزرتے ہوئے آج ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' ایک بسیط ادبی تاریخ کی صورت اختیار کر چکی ہے کتاب کے ابواب واسباق میں دوگنا اضافہ ہو چکا ہے اس کے علاوہ ابواب کی ترتیب میں بھی ردوبدل کیا گیا ہے یہ سب اس لیے کیا گیا کہ کتاب ادب کے قاری کے لیے عصری ضروریات کو پورا کر سکے، اس کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر وقتاً فوقتاً اپنے تنقیدی نظریات پر مبنی مباحث بھی شامل کرتے رہے ہیں ان تنقیدی مباحث کی کثرت نے کتاب کو نہ صرف ایک تنقیدی تاریخ کی صورت دے دی ہے بلکہ اس کی ضخامت میں بھی بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ اس کتاب کا آخری ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے دوگنا سے بھی کچھ زیادہ ضخیم ہے پہلی طباعت میں اس کتاب کے کل ۲۵۶ صفحات تھے اور آخری طباعت میں اس کے صفحات کی تعداد ۷۲۰ ہوگئی ہے۔ ذیل میں اول وآخر طباعتوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

پیش لفظ وانتساب: بارِ اول میں ایک مختصر سا پیش لفظ کتاب میں شامل کیا گیا تھا جس میں کتاب کی وجہ تصنیف کے حوالے سے سید محمود قاسم کی تحریک کا ذکر کیا گیا ہے، مصنف نے ادبی تاریخ نویسی کے اپنے اس نئے

تجربے کا ذکر کرتے ہوئے کتاب میں کمی کوتاہی کی موجودگی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، بارِ آخر کے پیش لفظ میں سید محمود قاسم کی تحریک اور ماہ نامہ ''کتاب'' کے لیے لکھے جانے والے مسودے کی تفصیلات موجود نہیں ہیں، آخری طباعت کے پیش لفظ میں ادبی حلقوں میں اس کتاب کے حوالے سے پیدا ہونے والے نزاعات، کتاب کی مقبولیت، مخالفین کی آراء اور ارتقاء کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، بارِ اول میں اس کتاب کا انتساب سید محمود قاسم کے نام کیا گیا تھا جبکہ آخری ایڈیشن میں مصنف نے کتاب کا انتساب اپنے بچوں، سائیکی سلیم، ارم سلیم اور جودت سلیم کے نام کیا ہے۔

مقدمہ: اولین طباعت میں اس کتاب کے لیے کوئی مقدمہ نہیں لکھا گیا جبکہ آخری ایڈیشن میں ایک مقدمہ ''تاریخ ادب ۔۔ مقاصد و محرکات'' کے عنوان سے شامل کیا گیا۔ یہ مقدمہ مضمون کی صورت میں اسی عنوان سے سہ ماہی ادبی رسالہ فنون، شمارہ نمبر ۳۱، جنوری ۔ فروری ۔ مارچ، سال نامہ، ۱۹۹۱ء، لاہور، مدیر احمد ندیم قاسمی، میں بھی چھپا ہے، اس مقدمے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے تاریخ اور ادبی تاریخ کی تعریف، تصورِ تاریخ، تاریخ کے ارتقاء کا سفر، ادبی تاریخ کے اصول وضوابط، جدید میلانات ورجحانات، اور اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی روایت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

ترتیبِ ابواب: اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا پہلا ایڈیشن کل چودہ ابواب پر مشتمل تھا جب کہ اس کتاب کے تیسویں ایڈیشن میں انتیس تفصیلی ابواب موجود ہیں اس نئے ایڈیشن میں پندرہ نئے ابواب قائم کیے گئے ہیں اور جو پرانے ابواب تھے ان کے عنوانات اور متن میں حسبِ ضرورت کانٹ چھانٹ اور اضافے کیے گئے ہیں۔ کتاب میں قائم کیے گئے نئے ابواب کی فہرست درج ذیل ہے۔

پہلا باب: طاؤس، تختِ طاؤس اور تخلیق۔

چوتھا باب: اصلاحِ زبان۔

پانچواں باب: زبان، قومی اور بین الاقوامی تناظر۔

چھٹا باب: تخلیقی رویے اور اصنافِ ادب۔

گیارہواں باب: اردو نثر کا ظہور، مستشرقین اور یورپین شعرائے اردو۔

بارہواں باب: داستان سرائے۔

پندرہواں باب: ادب اور پنجاب۔

سولہواں باب: مرثیہ عہد بہ عہد۔

اکیسواں باب: اردو صحافت اور ادبی جرائد۔

بائیسواں باب: پاکستان میں اردو ادب کی نصف صدی۔

تیئسواں باب: پاکستان میں اردو نثر کا تخلیقی منظر نامہ۔

چوبیسواں باب: پاکستان میں تحقیق وتنقید۔

پچیسواں باب: پاکستان میں شعر کی صورتِ حال۔

چھبیسواں باب: جوہر عورت کی نمود۔

اٹھائیسواں باب: ظرافت کا لحاف۔ میڈ ان پاکستان۔

انتیسواں باب: معاصر تخلیقات کا جھروکہ۔

ان پندرہ نئے ابواب کے علاوہ جو پرانے ابواب مسلسل قائم رکھے گئے ہیں ان میں سے بعض کے عنوانات میں رد و بدل کیا گیا ہے اور ابواب کے متن میں وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت تحریف و اضافت سے کام لیا گیا ہے، یعنی جن موضوعات پر ابتدائی ایڈیشنوں میں تشنگی رہ گئی تھی یا پھر بعد میں ان کی تفصیلات میں اضافے کی ضرورت محسوس کی گئی ان کو دوبارہ مزید مواد کے ساتھ ترتیب دیا گیا، ان ابواب کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

اردو ہے جس کا نام: اولین ایڈیشن میں یہ باب پہلے نمبر پر تھا جبکہ تیسویں ایڈیشن میں اس کو دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے، اس کا نام اول و آخر طباعتوں میں یکساں ہے، مصنف نے اس باب کے ذیل میں موجود مباحث میں تحریف و اضافت سے کام لیا ہے، پہلے ایڈیشن میں ،، اردو ہندی تھی ، ریختہ ، رسم الخط ، امیر خسرو ، شیر و شکر آمیختہ ، اردوئے معلیٰ ، اردو کا پہلا ادیب ، ، ہندوستانی ، اردو کے علاقائی نام ، اور اردو یا پاکستانی کے عنوانات شامل تھے، جب کہ حالیہ ایڈیشن میں ، دودھ اور پانی ، لسانی سنگم ، زبانِ یارِ من ترکی ، تخلیق و ثقافت کی زبان

فارسی، پاک زبان عربی، اردو تحقیق کے آئینے میں اور اردو کی پہلی نثری تصنیف کے عنوانات کے تحت تفصیلات میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر اس باب میں اردو کے قدیم ناموں، رسم الخط، اردو کے ابتدائی شعراء (مع نمونہ کلام)، لفظ اردو کے رواج، اردو زبان کے ساتھ دیگر زبانوں کے لسانی تعلقات، لفظ اردو پر ہونے والی تحقیقات، اردو کے اولین ادیب، اردو کے علائی ناموں اور اردو زبان سے متعلق ہونے والی جدید تحقیقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اردو زبان: آغاز کے بارے میں نظریات: بارِ اول میں یہ باب دوسرے نمبر پر رکھ گیا تھا اور بارِ آخر میں تیسرے نمبر پر لایا گیا، پہلی اشاعت میں اس باب کا نام ''آغاز کے بارے میں نظریات'' رکھا گیا تھا جب کہ حالیہ ایڈیشن میں اس کے نام میں ''اردو زبان'' کے الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اس کے ذیل میں دیے گئے عنوانات میں سے صرف ایک عنوان کو تبدیل کیا گیا ہے، بارِ اول میں ایک عنوان ''اردو زبان کا مزاج'' کے نام سے قائم کیا گیا تھا جس کو بارِ آخر میں ''اردو زبان کا ماخذ ہندکو۔۔۔منڈا زبان'' کے ساتھ تبدیل کر دیا گیا، اس باب کے ذیلی عنوانات میں، اردو اور اردو کا بازار، برج بھاشا کی بیٹی، پنجاب میں اردو، دکن میں اردو، سندھ میں اردو، ردعمل کے نظریات، اردو قدیم ویدک بولی، اردو مرہٹی کی سگی بہن، اور اردو دراوڑی کا عطیہ شامل ہیں، یہ باب اردو زبان کے آغاز کے بارے میں پیش کیے جانے والے مختلف نظریات واختلافات پر مبنی ہے۔

جنوبی ہند میں اردو ادب: طبع اول میں یہ باب، تاریخی عوامل، سرکاری سرپرستی، صوفیاء کا کردار، سب رس، مثنوی کی مقبولیت، دکھنی غزل، قلی قطب شاہ، ولی، اور دکھنی ادب کی اہمیت، نام کے عنوانات پر مشتمل تھا جب کہ طبعِ آخر میں اس باب کے ذیل میں، دکن کی انارکلی، ملا وجہی، پہلا انشائیہ نگار، ایک اور سب رس، اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ، ولی دہلی میں، کلام کی اشاعت، سراج اورنگ آبادی، اور گوجری / گجری کا اضافہ کر دیا گیا ہے، ان عنوانات کے تحت مصنف نے انشائیہ نگاری کے آغاز وارتقاء، اردو نثر کے آغاز، زنانہ شاعری کی ابتداء، اور ولی دکنی کے حوالے سے متعدد نئی معلومات کا اضافہ کر دیا ہے۔

شمالی ہند میں اردو ادب: ابتدائی اشاعت میں اس باب میں، ایسی بلندی ایسی پستی، تنقید کا آغاز: تذکرے، حاتم اور دیوان زادہ، میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، اور نظیر اکبر آبادی، نام کے کل سات عنوانات شامل تھے، موخر الذکر اشاعت میں، عالم میں انتخاب، دلی: مرکزِ شعر وسخن، افضل کا عشق اور شاعری،

بارہ ماسہ، بکٹ کہانی، چکوال میں اردو شاعری، زٹل تیری جعفر جہانگیر شد، فائز دہلوی، انحطاط کی جمالیات، پہلا نقاد، چند اور تذکرے، لذت النساء، خانِ آرزو، نقاشِ اول زبانِ ریختہ: مطہر جان جاناں، آبرو، وہم میں ڈالنا، اور قائم چاند پوری کے نام سے انیس نئے عنوانات کے تحت شمالی ہند کے کلاسیکی ادب کے منظر نامے کو وسعت دے دی گئی ہے۔

لکھنو کا دبستانِ شاعری: پہلے ایڈیشن میں اس باب میں گیارہ عنوانات، گزشتہ لکھنو، دربار اور شاعری، ناز و ادا کا اسلحہ خانہ ریختی، مثنوی، مرثیہ، لکھنویت کیا ہے، شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی، انشاء اللہ خان انشاء، قلندر بخش جرأت، خواجہ حیدر علی آتش، اور شیخ امام بخش ناسخ کے تحت لکھنو کے کلاسیکی ادب پر بحث کی گئی تھی، آخری ایڈیشن میں مرکزِ علم و ادب، حضرت محل عیش کوش، واجد علی شاہ بطور شاعر، بتِ شوخ و شنگ۔ گلزارِ نسیم، اردو کی بدنام ترین مثنوی، اردو کا پہلا سفر نامہ: عجائباتِ فرنگ، مصحفی دور ہے فرنگیوں کا، اور لکھنو کی عطا نام کے عنوانات کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

دہلی کے نامور شعراء: دہلی، دہلویت کیا نہیں، اسد اللہ خاں غالب، اشاعتِ کلام، آزادہ و خود بین، ذوق خامہ فرسائی، جدت جدت، مومن خاں مومن، نام نہند شیخ ابراہیم ذوق، پھرے ہے اتراتا، خاقانی ہند، محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ / حسرتی، میاں نصیر الدین نصیر، نواب مرزا خاں داغ، ابتدائی ایڈیشن میں اس باب کے عنونات تھے، جدید ایڈیشن میں، علامتی حکومت، آخری کیل، دہلی میں محفلِ شعر و سخن، دبستانِ بہار، گویم مشکل، نسخہ حمیدیہ، حضرت موسیٰ کی بہن، سب اچھا کہیں جسے، پاکستان میں غالب شناسی کی روایت، غالب: مصوری، کیلینڈر، ڈائریاں، معجزہ فن، شاعرانہ نکتہ آفرینی، اور بہادر شاہ ظفر کے نام سے ۱۳ عنوانات میں مغل حکومت کے زوال، غالبیات پر جدید تحقیقات، اور بہادر شاہ ظفر کی شاعری پر بحث کی گئی ہے۔

فورٹ ولیم کالج اور باغ و بہار: اس باب کا نام پہلے ایڈیشن میں ''فورٹ ولیم کالج اور اردو نثر کا ظہور تھا، حالیہ ایڈیشن میں اس کے نام کو تبدیل کر کے ''فورٹ ولیم کالج اور باغ و بہار'' رکھا گیا ہے بیشتر عنوانات میں رد و بدل کیا گیا ہے، چار عنوانات، انگریز اور اردو، مستشرقین، گارساں دتاسی، اور انگریز شعرائے اردو، نام کے عنوانات حذف کر دیے گئے ہیں، مذکورہ بالا عنوانات کے علاوہ پہلے ایڈیشن میں فورٹ ولیم کالج، ڈاکٹر جان گلکرسٹ، نصاب، پہلا سلیس نگار کون، میر امن، باغ و بہار: تحقیقی مطالعہ، نوطرز مرصع، کئی اور باغ و بہار، یورپ

میں باغ و بہار، باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ، تیکنیک، کردار نگاری، اور اسلوب کے عنوانات شامل تھے، آخری ایڈیشن میں ۹ نئے عنوانات، ایسٹ انڈیا کمپنی، فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات، گنج خوبی، دلی کا ایک اور روڑا، اور جان گلکرسٹ کے حوالے سے ہندوستان میں، فورٹ ولیم کالج سے تعلق، الوداع ہندوستان، شاعری، تصانیف، نام کے عنوانات شامل کر دیے گئے ہیں۔

سرسید تحریک اور ادبی نشاۃ ثانیہ: بارِ اول میں یہ باب بارہ عنوانات، ٹھہرے پانی میں پتھر، افکارِ نو کے پرچم، سرسید احمد خاں، ردِ عمل، نئی اصناف کی کونپلیں، سرسید کے نامور رفقائے کار، شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، شمس العلماء خان بہادر مولانا نذیر احمد، پہلا ناول نگار کون، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، محمد اسماعیل میرٹھی، پر مشتمل تھا، جب کہ بارِ آکر میں سرسید بطور تاریخ شناس، تہذیب الاخلاق، اکبر الہ آبادی، نشتر، خطِ تقدیر، جنون، انجمن پنجاب، رومانیت کا نقطہ آغاز، اور دو کا کوروی کے ساتھ مزید آٹھ نئے عنوانات کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

اردو ڈرامہ: پہلے ایڈیشن میں یہ باب سولہ عنوانات، شکنتلا اردو میں پہلا ڈرامہ، واجد علی شاہ: پہلا ڈرامہ نگار، امانت کی اندر سبھا، اندر سبھا کی تیکنیک، تھیٹر: بنگال میں، تھیٹر: بمبئی میں، تھیٹر: بلوچستان میں، پارسی تھیٹر، طالب بنارسی، احسن اور بے تاب، انڈین شیکسپیئر؟، آغا حشر کا فن، قدیم سٹیج، انارکلی، ادبی ڈراما، اور ترقی پسند ڈرامہ پر مشتمل تھا، آخری ایڈیشن میں مزید دس عنوانات، اولیت کا تاج، رہس، بیمار بلبل، پہلا پیشہ ور ڈراما نگار: آرام، رونق کا ڈراما، سرسید کا ڈراما، آغا حشر کاشمیری، رزقِ ہوا، ٹیلی ویژن ڈراما، اور ڈراما جگتوں کے بھنور میں، کا اضافہ کر دیا گیا۔

عبوری دور کا ادب: پہلی اشاعت میں اس باب میں، ادبی کھاد، ناول: تاریخ سے حقیقت نگاری تک، عبد الحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، رسوا، پہلی خاتون ناول نگار، لطیف موضوع رنگین اسلوب، تحقیق و تنقید، تبسم کی کرنیں، کون سا گیت سنو گی، اور شاعری: فکر اور احساس کی تصویر نام کے گیارہ عنوانات کے تحت عبوری دور کے ادب کی تفصیلات فراہم کی گئیں، آخری اشاعت تک آتے آتے اس باب میں، رسوا بطور شاعر، یگانہ اور شہرِ ستم گر، سانیٹ، ادبِ لطیف، اور نظم معراء اور آزاد نام کے مزید پانچ عنوانات شامل کر دیئے گئے۔

محرمِ رازِ درونِ میخانہ: ابتداء میں اس باب میں سات عنوانات، بڑا داغ؟، غزل میں نئی جہت، افکارِ

تازہ سے جہانِ تازہ، شخصیت: کلام کے آئینے میں، فن اور اسلوب، تصانیفِ اقبال، اور خودی کا مرکز شامل تھے، تازہ ترین ایڈیشن میں مزید عنوانات، میری تمام سرگزشت، اقبال کا شجرہ نسب، مرا طریق امیری نہیں، سیاسی سرگرمیاں، پیامِ اقبال، اقبالیات کی نصف صدی (پاکستان میں)، مدح سرائی، متنازعہ شخصیت، اقبال شناسی، اقبالیات کی درجہ بندی، اقبال: تحقیق، تراجم، شرح، اور اقبال ممدوح عالم کے تحت اقبالیات کے حوالے سے جدید تحقیقی معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک: ترقی پسند تحریک کے ضمن میں پہلی اشاعت میں قائم کیے گئے باب میں کل تیرہ عنوانات، آغاز، مقاصد، جنس، احتجاج احتجاج، ترقی پسندوں کا ہراول: پریم چند، افسانہ، ناول، خاکہ نگاری، شاعری، تنقید، ردِعمل، اور خاتمہ شامل تھے، جدید ایڈیشن میں درج بالا عنوانات میں تحریف واضافت کے ساتھ مزید تین عنوانات، ترقی پسند اور سیاست، جل بجھے انگارے، اور حلقہ اربابِ ذوق کا اضافہ کیا گیا ہے۔

بارِ اول کے آخری دو ابواب، ''پاکستان میں ادب کا جائزہ'' اور ''پاکستان میں ادبی تجربات اور نئے رجحانات'' کے مباحث کو وسعت دے کر جدید ایڈیشن میں کل چھ ابواب قائم کیے گئے ہیں اور پاکستان میں نمو پانے والے ادب پر تفصیلی بحث کی گئے ہے۔ ان تمام ابواب تفصیلی کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔

ہ۔ سنین کے اندراج کا مسئلہ:

اردو کی ادبی تاریخ نویسی میں سنین کے اندراج کا معاملہ ہمیشہ سے پیچیدہ اور متنازعہ رہا ہے محققینِ ادب سنین کی صحت سے متعلق تحقیق و تدقیق کے فرائض سرانجام دیتے رہتے ہیں اس ضمن میں مختلف ادوار میں شخصیات اور کتب کے سنین حوالے سے تاریخی دستاویزات و ماخذات کی چھان پھٹک سے درست سنین کی دریافت کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں، لیکن اختلافِ رائے کے باعث محققین و مورخین ادب کسی ایک سنہ پر متفق نہیں ہو پاتے، اردو کی ادبی تاریخ نویسی میں سنین کے حوالے سے ایک اور اہم مسئلہ ہجری اور عیسوی سنین کا ہے، بعض مورخین ہجری اور بعض عیسوی کیلینڈر کے تحت درج کرتے ہیں بعض ادبی تواریخ میں مخلوط انداز میں سنین درج کیے جاتے ہیں کہیں ہجری سنہ ہوتا ہے تو کہیں پر عیسوی سن دیا جاتا ہے اس حوالے سے اگر اردو کی ادبی تواریخ کا جائزہ لیا جائے تو معروف ادبی شخصیات و کتابیات کے سنین بھی کچھ کے کچھ ملتے ہیں، ایسی صورتِ حال میں اردو ادب کے عام قاری اور طالب علم کے لیے خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے تیسویں ایڈیشن کے پیش لفظ میں اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> اہم ادبی وقوعات میں اشاعتِ کتب یا شخصیات کی پیدائش اور موت کے سنین پر بعض اوقات محققین کا اتفاقِ رائے نہیں ہوتا۔ سو جس سن پر اکثریت کو متفق پایا اُسے قبول کر لیا ۔ اس بحث میں الجھے بغیر کہ بقیہ سنین کیوں قابلِ قبول نہیں ہیں (ایسے تحقیقی مباحث کتاب کی حدود سے متجاوز ہیں) قدیم سنین کے ضمن میں ہجری اور عیسوی کیلنڈر کی بنا پر بعض اوقات خاصی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں اس لیے تا حدِ امکان دونوں سنین درج کرنے کی کوشش کی۔ (۴)

اس بیان سے قطع نظر اگر کتاب میں سنین کے اندراج کی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مصنف بھی بعض مقامات پر سنین کی الجھنوں کا شکار ہو گئے ہیں، اور بعض سنین کے اختلافات پر مصنف نے بحث تو کی ہے لیکن حتمی طور پر درست سن کی نشاندھی نہیں کی، اقبالیات کے باب ''محرمِ رازِ درونِ میخانہ۔۔اقبال'' میں علامہ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اقبال کی تاریخ پیدائش نزاعی ہے، اور محققینِ اور اقبالیات کے ماہرین کا ابھی تک کسی ایک تاریخ پر اتفاق نہیں ہو سکا۔ میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے ریکارڈ کے مطابق ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء تاریخ ہی درست قرار پاتی ہے لیکن اس میں مولود کا نام درج نہیں، اس لیے اسے درست تسلیم کرنے میں شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال کی بڑی بہن کے مطابق یہ تاریخ دراصل اقبال کے بڑے بھائی کی ہے جو شیر خوارگی میں فوت ہو گیا تھا۔ اقبال کی اپنی تحریروں سے بھی اس تاریخ کی توثیق نہیں ہوتی۔ عبدالواحد معینی نے ''نقشِ اقبال'' میں اس ضمن میں نئے شواہد فراہم کر کے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء (۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ) کو صحیح تاریخ قرار دیا ہے۔ اقبال کی بیشتر سوانح عمریوں میں ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء ہی تاریخ پیدائش ملتی ہے۔ (۵)

اس کتاب میں بیشتر سنین عیسوی کیلنڈر کے تحت ہی دیے گئے ہیں جن سنین کے بارے میں جدید

تحقیقات نے شکوک پیدا کر دیے ہیں ان کے بارے میں تفصیلات بھی دی گئی ہیں، کتب کی اشاعت کے سنین کے حوالے سے مصنف نے اشاعتِ اول کے سنہ کا خصوصی التزام کیا ہے، فورٹ ولیم کالج کی تمام اہم کتابوں کی فہرست مع سن اشاعت مہیا کر دی گئی ہے، مجموعی طور پر مصنف نے اس کتاب میں بہتر طور سے سنین کے اندراج پر کام کیا ہے۔

ر۔ محققین کی آراء:

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کی اشاعت پر جہاں ڈاکٹر سلیم اختر کو دادِ تحسین سے نوازا گیا وہاں ان کی مخالفت میں بھی بیانات سامنے آتے رہے، کوئی بھی کتاب خواہ وہ تاریخی ہو، تنقیدی یا تخلیقی اس پر نزاعی مباحث کا جنم لینا ایک علمی ضرورت ہے انہی مباحث کے باعث اغلاط کی نشاندہی ہوتی ہے اور کتاب کے مقام و مرتبے کا تعین ممکن ہو جاتا ہے، اس کتاب کے بارے میں جو مخالف بیانات آئے مصنف نے ان کو ذاتی عناد اور دشمنی کا پرتو کہا ہے لیکن درحقیقت بعض بیانات میں صداقت بھی ہے اور شاید مصنف کو ان بیانات کی روشنی میں کتاب میں موجود اغلاط کی درستی میں مدد بھی ملی ہو، کتاب کے حق میں جو بیانات آئے ہیں ان میں کچھ تو انصاف کے تقاضوں پر پورا اترتے ہیں لیکن بعض نے کلی طور پر مدلل مداحی کے فرائض س انجام دیے ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں محققین ادب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین اردو ادب میں تحقیق و تنقید کا ایک اہم نام ہے ادبی تواریخ کے تعارف و تنقید پر مبنی ان کی ایک اہم کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' ہے جس میں انہوں نے ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب اردو اب کی مختصر ترین تاریخ کو کم اہم ادبی تواریخ کے زمرے میں رکھتے ہوئے اس کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے۔

> یہ تاریخ محققانہ نوعیت کی نہیں ہے نصابی ہے اندازِ گفتار میں ہر جگہ علمی سنجیدگی نہیں، صحافیانہ اور بولی ٹھولی کا انداز اختیار کرنے کا لپکا ہے۔ مثلاً عنوانات ملاحظہ ہوں، تبسم کی کرنیں، فلسفہ اور تنقید کی مکھیاں، ٹھہرے پانی میں کنکر، ادبی کھاد، ناز و ادا کا اسلحہ خانہ ریختی، پھول جمع کرنے والے، انشائیے کا سیاپا۔ تحقیقی کتاب میں ہم گفتگو کا یہ انداز سوچ بھی نہیں سکتے۔ پھر ذاتی نوک جھوک بھی ہے مثلاً تاریخ

ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہندالمعروف بہ حکایات عجیب وغریب ولطائف دل پذیر۔وزیر آغا کے لیے لکھتے ہیں۔اردو شاعری کا مزاج ایک نزاعی کتاب ہے جس کا رشید ملک نے ''معاصر'' میں مطبوعہ مقالہ میں جدید ترین علوم کی روشنی میں پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے اس کے بنیادی تھیسس کولغواور بے معنی ثابت کیا۔انھوں نے سرقے کی مثالیں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کی علمیت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ (۶)

ان نقائص کی نشاندھی کرنے کے بعد گیان چندجین اس کتاب کی خوبیوں کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں۔

لیکن اس تاریخ میں کہیں کہیں کام کی تحقیقی معلومات بھی مل جاتی ہیں مثلاً ص ۳۷۔۱۳۶ پر مستشرقین کے بارے میں یا ص ۱۴۱ پر یورپ میں باغ و بہار یا چکوال میں اردو کے تحت شاہ مراد (تاریخ وفات ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء) کا ایسا ریختہ جس کے تحت تین اردو اشعار ہیں محض ایک شعر میں نصف مصرعہ فارسی کا ہے۔انشائیے کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں کہ یہ اصطلاح سب سے پہلے اختر دینوی نے ۱۹۴۴ء میں استعمال کی ۔۔اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ کے بارے میں مطلع کرتے ہیں کہ وہ ماہ لقا چندا بائی نہیں ،لطف النساء امتیاز ہے۔۔۔پہلی خاتون ناول نگار کے سلسلے میں وقار عظیم کے ایک مضمون کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ رشیدۃ النساء بیگم والدہ محمد سلیمان بیرسٹر،ہمشیرہ شمس العلماء سید امداد امام ہیں ۔۔۔کتاب میں تحقیقی اغلاط کافی ہیں جن کی نشاندہی ضروری نہیں آخری ابواب میں ۶۸ جدید اردو ادیبوں کے بارے میں مفید تنقیدی مشاہدات ہیں لیکن یہ پاکستانی ادیبوں تک محدود ہیں ،کسی ہندوستانی ادیب کا نام نہیں لیا۔یہ تفریق حیران کن ہے۔(۷)

ڈاکٹر گیان چندجین کے اس بیان سے متعلق اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس وقت جب وہ یہ اقتباس لکھ رہے تھے تو ان کے پیشِ نظر اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا ساتواں ایڈیشن تھا، اگر جدید ایڈیشن کے بارے میں ڈاکٹر گیان چندجین اپنی آراء لکھتے تو شاید وہ کچھ اور طرح کی ہوتی۔

ڈاکٹر جلیل اشرف نے اپنی کتاب ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت نقاد میں اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے بارے میں کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

> سلیم اختر کی یہ کتاب پاکستان کی حد تک تو Best seller قرار دی جا چکی ہے۔ اس وقت اس کا مارکیٹ میں چودھواں ایڈیشن فروخت ہو رہا ہے۔ وہ ہر ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے تاریخ اشاعت تک یہ کتاب Up to date رہتی ہے۔ ہر سال سوا سال بعد اس کتاب کا ایک نیا ایڈیشن چھپ جاتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے خود بتایا ہے۔ اب پھر وہ اسے مکمل طور پر دوبارہ لکھنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں ۔کئی سال ہوئے کہ حکومت پاکستان نے اس کتاب کو سول سروس کے اعلیٰ ترین امتحان CSS کے نصاب میں بھی شامل کر دیا ہے جو ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔(۸)

یہ کتاب ڈاکٹر جلیل اشرف نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے اس مقالے سے مرتب کی جو انھوں نے ۱۹۹۱ء میں رانچی یونیورسٹی (بہار بھارت) میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش کیا۔ مقالے کے تحقیقی امور کے سلسلے میں چوں کہ وہ ڈاکٹر سلیم اختر کے ممنون رہے اس لیے ان کی آراء میں آزادانہ تحقیقی و تنقیدی روش مفقود ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اپنی ادبی تاریخ اردو ادب کی مختصر تاریخ میں ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ نویسی پر کچھ اس طرح کی رائے دیتے ہیں۔

> اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے مختلف ایڈیشنوں میں اصناف اور مصنفین کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے تنقیدی فیصلوں اور آراء کو بار بار تبدیل کیا ہے۔ ایسی واقعاتی اغلاط کو جن کی نشاندہی خواجہ محمد ذکریا اور متعدد دوسرے لوگوں نے کر دی تھی تا حال رفع نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اس کتاب میں استحکام فکر و نظر کی خاصی کمی نظر آتی ہے۔(۹)

ڈاکٹر انور سدید کی اس کتاب میں دیگر ادبی تواریخ پر دی جانے والی آراء اور ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ پر دی گئی آراء کا تقابل کیا جائے تو ان کی معاصرانہ چشمک کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شاہین مفتی نے اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام کتابی سلسلہ پاکستانی

معمار نمبر ۱۱۹ ،ڈاکٹر سلیم اختر : شخصیت وفن میں اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ پر یوں تبصرہ کیا ہے۔

> یہ کتاب ایک دلکش منی ایچر ہے۔ اردو ادب کے تمام اہم ناموں سے مزئین آغاز میں اڑھائی سو صفحات کا انسائیکلو پیڈیا ہے، جسے سلیم اختر کی تخلیقی قوتوں نے اپنی جدت پسند طبیعت کے مطابق چٹخارے دار اور قابل توجہ بنا کر پیش کیا ہے ۔۔۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی اس کتاب پر ایک الزام اٹھایا جاتا ہے کہ انھوں نے کتاب میں کئی مقامات پر تعصب برتا ہے حالاں کہ یہ تعصب ہی تاریخ نگاری کی بالغ نظری کا ثبوت ہے ۔ مصنف نہ تو کسی سے مرغوب ہے اور نہ ہی خوف زدہ اس طرح وہ سوچے سمجھے توازن اور اعتدال کو بھی اہمیت نہیں دیتا۔ یہ کتاب اس لیے دلچسپی کا باعث ہے کہ اس میں مصنف کے اپنے تعصّبات، پسندیدگیاں، نظریات اور میلانات عکس کشی کرتے ہیں (۱۰)

ڈاکٹر شاہین مفتی نے تعصب کو تاریخ نگار کی بالغ نظری قرار دے کر اپنے نظریہء تاریخ نویسی کے نا بالغ ہونے کا ثبوت دیا ہے بظاہر ان کا یہ تبصرہ ڈاکٹر سلیم اختر کی تعریف لگتا ہے لیکن درحقیقت انھوں نے مصنف کو ایک متعصب اور اور نا تجربہ کار مؤرخ ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہے۔

ڈاکٹر روش ندیم نے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے مجلّہ معیار میں ڈاکٹر عامر سہیل اور نسیم عباس احمر کی مرتبہ کتاب ادبی تاریخ نویسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ نگاری کے متعلق لکھا ہے:

> ہمارے کلاسیکی ذہنی رویئے کے حامل محققین نے تحقیق کے نام پر ادبی تواریخ کی روایت میں جو بگاڑ پیدا کیا ہے اس کا اثر گزشتہ تین نسلوں پر دکھائی دیتا ہے۔ اسلوب کے حوالے سے ادبی تاریخ نویسی کے مباحث کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے تا کہ نہ تو محمد حسین آزاد جیسے انشائی اسلوب کو ماڈل تصور کیا جائے اور نہ ہی ڈاکٹر سلیم اختر کی مختصر ترین تاریخ کے ان حصوں کو جہاں وہ جھنجھلاہٹ ، چشمک اور غصے کا شکار ہو کر طنزیہ علامتی انداز اختیار کرتے ہیں جو دلچسپ تو ہو سکتا ہے لیکن قابل تقلید نہیں (۱۱)

ان تمام آراء کی روشنی میں ڈاکٹر سلیم اختر کی ادبی تاریخ نویسی کا جائزہ لیا جائے تو بعض ایسے نقائص ان

کی کتاب میں سامنے آتے ہیں جن پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے خاص کر ذاتی نوک جھوک اور غیر سنجیدہ زبان کا استعمال ادبی تاریخ نویسی میں ایک منفی رویئے کے طور پر سامنے آتے ہیں، ڈاکٹر وزیر آغا کی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' سے متعلق مصنف نے اپنی تاریخ کے تیسویں ایڈیشن کے صفحہ ۹۱-۶۹۰ میں بہت کچھ سخت و سست کہا ہے جو کہ ایک ادبی مورخ کی شان کے بالکل منافی ہے، ادبی تاریخ نویس کو ذاتی عناد اور تعصّبات سے بالا تر ہو کر تحقیق و تنقید کے فرائض سرانجام دینے چاہئیں، تحقیقی تحاریر میں غیر سنجیدہ زبان کا استعمال بھی قاری کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے، تحقیق و تنقید کے توازن کے حوالے سے ابتدأیہ ایک اچھی کتاب تھی، جدید ادبی تحقیقات کا دائرہ وسیع ہے، ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے یہ کتاب اہم ادبی تواریخ کی صف میں جگہ بنا چکی ہے، اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کی مسلسل جد و جہد بھی قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو بنانے سنوارنے میں عمر صرف کر دی۔

ح۔ ابواب بندی:

تازہ ترین ایڈیشن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کو ۲۹ ابواب میں تقسیم کیا ہے اس ایڈیشن میں ترمیم شدہ پیش لفظ اور ایک مقدمہ، ''تاریخ ادب ۔۔۔ مقاصد و محرکات'' کے نام سے شامل کیا گیا ہے، کتاب کی ابواب بندی کی تفصیلات ذیل میں دی جاتی ہیں۔

پیش لفظ: پیش لفظ میں مصنف نے کتاب کے آغاز و ارتقاء، شہرت، اشاعت کے بعد پیدا ہونے والے نزاعات، تحریف و اضافت، اور کتاب کے حوالے سے اپنی جد و جہد کا ذکر کیا ہے۔

مقدمہ: کتاب کے مقدمے میں مصنف نے تاریخ کی تعریف، تاریخ نویسی کے آغاز و ارتقاء، ادبی تاریخ نویسی کے رجحانات، اردو ادب میں تاریخ نویسی کے آغاز و ارتقاء، تاریخ نویسی کے اصول و ضوابط، اور ادبی تاریخ نویسی کی روایت پر روشنی ڈالی ہے۔

باب نمبر ۱۔ طاوس تختِ طاوس اور تخلیق: اس باب میں شاعر کی تخیلاتی پرواز پر پڑنے والے جغرافیائی، معاشرتی اور سماجی اثرات کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، اس ضمن میں موسم کی گدگدی، کنول اور نین کنول، جغرافیہ کی بیساکھیاں، نخلِ ماتم، ہر چند ہو مشاہدہ اور قفس رنگ نام کے عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، خواجہ حیدر علی آتش اور ولی دکنی کے اشعار بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں، اس باب میں اردو شاعری کی

علامات وتراکیب کے بارے میں دلچسپ معلومات دی گئی ہیں ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

> وہ بلبل جسے غالب نے ''قفس رنگ'' کہا تھا ایران میں ہوتا ہے۔ ہم جسے بلبل سمجھتے ہیں وہ گل دُم ہے اور اس میں کوئی خاص خوبصورتی نظر نہیں آتی۔ اسی طرح جس نرگس نے انتظار مرض اور چشم کے لاتعداد استعارے فراہم کیے وہ ہمارا پھول نہیں، آج کل دولت منداور اسی لیے کلچرڈ بیگمات جسے نرگس سمجھ کر مہنگے داموں خرید کر ڈرائنگ روم کی زینت بناتی ہیں وہ ''ورڈز ورتھ'' والا دیفوڈیل ہے۔(۱۲)

''موتی اور دہن شاعر''، اور ظلِ سبحانی، کے عنوانات کے تحت دربار سے وابستہ شعری روایت اور اس سے متعلق انوکھے واقعات درج کیے گئے ہیں ساتھ ہی لکھنوی معاشرے کی آرام پسندی میں نمو پانے والے زنانہ پن سے متعلق نفسیاتی بحث کی گئی ہے، نصیر الدین حیدر شاہ کے بارے میں ایک دلچسپ وقوعہ اس طرح سے دیا گیا ہے۔

> نصیر الدین حیدر شاہ، واجد علی شاہ سے بھی بڑھ کر تھا جسے آج کی نفسیات میں "TRANSVESTITE" کہا جا سکتا ہے، وہ زنانہ لباس پہن کر دردِ زہ میں مبتلا ہو کر بچہ جنتا'' (اس کی بغل میں بطور بچہ ایک مرصع گڑیا لٹا دی جاتی تھی) ''وضعِ حمل'' کے بعد وہ زچہ کی مخصوص غذائیں کھاتا۔ ایامِ زچگی کے تمام غسل کرتا، زنانہ پوشاک پہن کر زچہ خانہ سے باہر آتا، بچے کی منہ دکھلائی ہوتی، نذریں پیش کی جاتیں۔(۱۳)

آخر میں ''ادب زیست پیما'' کے عنوان سے ادب اور زندگی سے وابستہ سماجی اور معاشرتی تغیرات اور قدیم ترین تاریخی ماخذات پر مختصر بحث کی گئی ہے۔

باب نمبر۲۔ اردو ہے جس کا نام: اس باب میں، اردو ہندی تھی، رسم الخط، ریختہ، امیر خسرو، ضمیر کن فکاں، شیر وشکر آمیختہ، اردوئے معلیٰ، لسانی سنگم، زبانِ یارِ من ترکی، تخلیق وثقافت کی زبان: فارسی، پاک زبان: عربی، اردو: تحقیق کے آئینے میں، اردو کا پہلا ادیب، اردو کی پہلی نثری تصنیف، ہندوستانی، اردو کے علاقائی نام اور اردو یا پاکستانی کے عنوانات کے تحت اردو کے قدیم ناموں، رسم الخط، اردو اور دیگر زبانوں کے لسانی رشتوں، لفظ اردو کے رواج اور اردو کی اولین شعری ونثری تصانیف کی تفصیلات درج ہیں، مصنف نے امیر خسرو کا خصوصی

طور سے ذکر کیا ہے، مجموعی طور پر اس باب میں اردو لسانیات پر بحث کی گئی ہے اور زبان و ادب کے حوالے سے شعراء کا نمونہ کلام بھی دیا گیا ہے۔

باب نمبر۳۔ اردو زبان: آغاز کے بارے میں نظریات: اس باب میں اردو زبان کے آغاز کے بارے میں محققینِ ادبِ اردو کے مختلف نظریات پر مبنی بحث شامل کی گئی ہے۔ عنوانات میں اردو اور اردو کا بازار، برج بھاشا کی بیٹی، پنجاب میں اردو، دکن میں اردو، سندھ میں اردو، ردِعمل کے نظریات، اردو قدیم ویدک بولی، اردو مرہٹی کی سگی بہن، اردو دراوڑی کا عطیہ، اردو کا ماخذ: ہندکو، اور منڈا زبان شامل ہیں، زبان کے آغاز کے حوالے سے نظریات کے تنوع اور نزاعات کی بحث کو سلیم اختر یوں سمیٹتے ہیں۔

> مختصر ترین الفاظ میں یہ وہ نظریات ہیں جن سے ہم اردو کے آغاز اور اس کی تشکیل میں مدد محرکات اور صورت پذیری کے باعث بننے والے اہم عناصر سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ان نظریات میں سے کلیتًا نہ تو کسی کی تردید کی جاسکتی ہے اور نہ ہی کسی ایک پر دوسرے کو خصوصیت سے ترجیح دی جاسکتی ہے۔ سب میں کسی نہ کسی حد تک صداقت موجود ہے۔ یہ جزوی سہی مگر اس سے چشم پوشی بھی تو نہیں کی جاسکتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو لسانیات نے محدود عرصہ میں جو گراں قدر تحقیقات سرانجام دیں اور ان کے نتائج میں نظریات کا جو تنوع ملتا ہے وہی تو ہماری لسانیات کا اصل سرمایہ ہے۔ یہ نظریات اپنے تضادات، انتہا پسندی، یا خامیوں کے باوجود بھی مختلف رنگوں اور وضع کے ان شیشوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو انفرادی حیثیت میں تو چاہے کچھ بھی ہوں لیکن مل کر جب ایک "Mosaic" کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو پھر اردو زبان یا ''اردو کی زبان'' کی ایک تصویر بن جاتی ہے۔ یہ تصویر مکمل نہ سہی اور اس میں قطعیت کا فقدان بھی تسلیم! لیکن اس کے ''رنگین'' ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہی ''رنگینی'' اردو لسانیات کی خصوصیت قرار پاتی ہے۔(۱۴)

باب نمبر۴۔ اصلاحِ زبان: اس باب میں حسنِ گلشن، لفظ کی توانائی، باغ کا جھاڑ جھنکار، اچھوت الفاظ، لفظ کسوٹی، خان آرزو، اسالیب کی مثلث، متروکات کا منفی عمل اور اسلوب سازی کے عنوانات کے تحت،

اصلاحِ زبان کی تحریک کے آغاز وارتقاء، اور متروکات کے متعلق اہم مباحث شامل کیے گئے ہیں، مصنف نے ناسخ کے متروکات کے عمل کو منفی رویہ قرار دے کر انشاء اللہ خان انشاء کی جدت طرازی کو سراہا ہے، متروکات کے سلسلے میں پیش کی جانے والی بحث اہمیت کی حامل ہے۔

باب نمبر ۵۔ زبان : قومی اور بین الاقوامی تناظر: اس باب میں زبان کے عالمی تناظرات ، انسانی معاشرے میں زبان کی اہمیت، دنیا کی زبانوں کے بارے میں بین الاقوامی تحقیقات، لفظ کی حرکت اور تغیرات، قدیم اردو الفاظ، زبانوں کو درپیش خطرات ، اردو زبان کے مقام و مرتبہ، اور اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ذیلی عنوانات میں، زبان اور معاشرہ، لفظ کا سفر، زبان کی سرگم، وہ ہوئے ہم کلام، اخوت کی زبان، زبانوں کی معدومیت، لفظ ۔۔آقا، اور زبان اور قومی مقاصد شامل ہیں۔

باب نمبر ۶ ۔تخلیقی زاویے اور اصنافِ ادب: مصنف نے اس باب میں ہندوستان کی قدیم شعری اور نثری اسلوبیات اور ادب کی مختلف اصناف کا تعارف پیش کیا ہے اور گراف کے ذریعے سے اصنافِ ادب کی مقبولیت کی وضاحت کی ہے۔ اس کے علاوہ مشاعرے کے آغاز وارتقاء، اور روایت پر بھی روشنی ڈالی ہے، ذیلی عنوانات میں ، جرسِ غنچہ کی صدا، پردہ اٹھتا ہے ، دیوی کے چرنوں میں شعر کا نذرانہ، رگ وید اور ناٹک، فردوس کوش، حیوانی حکایات، خیال کی الفاظ بندی ، مقامی اصناف، ڈرامے کا ڈرامہ، اصنافِ سخن تعریف و حدود، قصیدہ، ٹیڑھی پسلی ،مثنوی ، مرثیہ، شہر آشوب، قطعہ، رباعی ، دوہا، کھلی فضا میں جیون، شدھ آتما، گیت ، اصنافِ ادب کا شناختی کارڈ، تخلیق کا جن، معیار سازی ، اصناف کے سکے، مشاعرہ کا کلچر، مشاعرہ کی فضا، مشاعرہ اور ذوقِ سخن، دہلی کے مشاعرے، زنانہ مشاعرہ، دادِ بے داد، اور پشاور میں مشاعرے شامل ہیں ، اس کے علاوہ اس باب میں بھی شعراء اور شاعرات کا نمونہ کلام دیا گیا ہے۔

باب نمبر ۷۔ جنوبی ہند میں اردو ادب: یہ باب تاریخی عوامل ، سرکاری سرپرستی ، صوفیا کا کردار، سب رس ، دکن کی انارکلی، ملا وجہی ۔۔ پہلا انشائیہ نگار، ایک اور سب رس، مثنوی کی مقبولیت، دکنی غزل، قلی قطب شاہ، اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ، ولی ، ولی دہلی میں، کلام کی اشاعت ،سراج اورنگ آبادی ، دکن میں اردو نثر، دکھنی ادب کی اہمیت ، اور گوجری رگجری کے عنوانات پر مشتمل ہے، مصنف نے اس باب میں دکن کی سیاسی صورتِ حال، لسانی اور ادبی اتار چڑھاو اور دکن کے بادشاہوں کے ادبی ذوق پر روشنی ڈالی ہے۔

باب نمبر ۸۔ شمالی ہند میں اردو ادب: مصنف نے اس باب میں دلی کی سیاسی و سماجی صورتِ حال، شعر و ادب کے آغاز و ارتقاء، تذکرہ نویسی کی روایت، ایہام گوئی کی تحریک، مثنوی، اور اردو شاعری کے زریں دور کے اہم شعراء کا تعارف مع نمونہ کلام پیش کیا ہے۔ ذیلی عنوانات میں عالم میں انتخاب، دلی: مرکزِ شعر و سخن، افضل کا عشق اور شاعری، بارہ ماسا، بکٹ کہانی، چکوال میں اردو، شاکر، زٹل تیری جعفر جہانگیر شد، فائز دہلوی، انحطاط کی جمالیات، ایسی بلندی ایسی پستی، تنقید کا آغاز: تذکرے، پہلا نقاد، چند اور تذکرے، لذت النساء، نقاش اول زبانِ ریختہ، خانِ آرزو، حاتم اور دیوان زادہ، آبرو، وہم میں ڈالنا، میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، خواجہ میر درد، چٹکلے باز شاعر: نظیرا کبر آبادی، اور قائم چاند پوری شامل ہیں۔

باب نمبر ۹۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری: اس باب میں مصنف نے گزشتہ لکھنؤ، حضرت محل، مرکزِ علم و ادب، عیش کوش، دربار اور شاعری، واجد علی شاہ بطور شاعر، بتِ شوخ و شنگ، ناز و ادا کا اسلحہ خانہ: ریختی، مثنوی گلزارِ نسیم، اردو کی بدنام مثنوی، مرثیہ، لکھنویت کیا ہے، شیخ غلام مصطفیٰ ہمدانی مصحفی، انشاءاللہ خان انشاء، شیخ قلندر بخش رنگین امان جرأت، خواجہ حیدر علی آتش، شیخ امام بخش ناسخ، اردو کا پہلا سفر نامہ، عجائباتِ فرنگ، مصحفی دور ہے فرنگیوں کا، اور لکھنؤ کی عطا نام کے عنوانات کے تحت لکھنوی تہذیب و تمدن کے عروج و زوال، اہلِ لکھنؤ کی عیش کوشی اور اس کے زیرِ اثر پنپنے والے ادب، لکھنؤ کی علمی و ادبی اہمیت اور نامور شعراء کا تعارف پیش کیا ہے۔

باب نمبر ۱۰۔ دہلی کے نامور شعراء: ڈاکٹر سلیم اختر نے اس باب میں مغل حکومت کے دورِ زوال کی روداد، غالب کی شخصیت اور فن، اور اس عہد کے نامور شعراء کے حالات مع نمونہ کلام پیش کیے ہیں۔ اس باب کے عنوانات میں علامتی حکومت، آخری کیل، دہلی، دہلی میں محفلِ سخن، دہلویت کیا نہیں، دبستانِ بہار، اسداللہ خاں غالب، گویم مشکل، اشاعتِ کلام، نسخۂ حمیدیہ، آزادہ و خود بیں، ذوقِ خامہ فرسائی، جدت جدت، حضرت موسیٰ کی بہن، سب اچھا کہیں جسے، پاکستان میں غالب شناسی کی روایت، تنقید، تحقیق، شرح، غالب: مصوری، کیلنڈر، ڈائریاں، معجزہ فن، تصویر کا ذائقہ، شاعری اور مصوری میں مصافحہ، مومن خان مومن، نام نہند، شاعرانہ نکتہ آفرینی، شیخ ابراہیم ذوق، پھرے ہے اتراتا، خاقانیِ ہند، بہادر شاہ ظفر، محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ، میاں نصیر الدین نصیر، نواب مرزا خاں داغ شامل ہیں۔

باب نمبر۱۱۔ اردو نثر کا ظہور، مستشرقین اور یورپین شعرائے اردو: بنگال میں اردو، انگریز اور اردو، کتابیں اپنے آبا کی، فرانسیسیوں کی اردو شناسی، مستشرقین، گارسیں دتاسی، ڈاکٹر اسپرنگر، انگریز شعرائے اردو، اور سویت یونین میں اردو کا مطالعہ اس باب کے عنوانات میں شامل ہیں، اس باب میں اردو زبان وادب کی ترقی میں بنگال کی اہمیت، انگریز حکمرانوں کی اردو پسندی، ایسٹ انڈیا کمپنی، ہندوستانی مخطوطات، غیر ملکی محققینِ اردو، انگریز شعرائے اردو اور سویت یونین میں اردو ادب کے فروغ وترویج کے مباحث کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

باب نمبر۱۲۔ داستان سرائے: یہ باب تحیر کی تال پر دھڑکتا دل، سائنسی افسانے، ماضیٔ بعید کا تحفہ، ناطق پرندے، ثقافتی تبادلہ، فردوس گوش، میر باقر علی داستان گو، بحر القصص۔۔۔ داستانِ امیر حمزہ، فسانۂ عجائب، الف لیلیٰ، انشاء کی انشاپردازی، بیتال پچیسی، بوستانِ خیال، اور اردو کی پہلی داستان، جیسے عنوانات پر مشتمل ہے، اس باب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے داستان اور اس کے آغاز وارتقاء پر بحث کی ہے۔

باب نمبر۱۳۔ فورٹ ولیم کالج اور باغ و بہار: یہ باب فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات سے متعلق ہے اس باب میں مصنف نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی خدمات، تصانیف، باغ و بہار اور فورٹ ولیم کالج کی دیگر مطبوعات کے بارے میں معلومات پیش کی ہیں، اس باب کے عنوانات میں، ایسٹ انڈیا کمپنی، فورٹ ولیم کالج، ڈاکٹر جان گلکرسٹ: ہندوستان میں، فورٹ ولیم کالج سے تعلق، الوداع: ہندوستان، شاعری، تصانیف، نصاب، فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات، پہلا سلیس نگار کون، میر امن، گنج خوبی،، دلی کا ایک اور روڑا، اور باغ و بہار کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، نو طرزِ مرصع، کئی اور باغ وبہار، باغ وبہار کا ماخذ، یورپ میں باغ و بہار، باغ وبہار: تنقیدی مطالعہ، تکنیک، کردار نگاری، اور اسلوب شامل ہیں۔

باب نمبر۱۴۔ سرسید تحریک اوادبی نشاۃ الثانیہ: سرسید تحریک اور اس کے ردِ عمل سے متعلق اس باب میں مصنف نے اردو کی ادبی روایت میں جنم لینے والے جدید رجحانات، سرسید اور ان کے رفقاء کی ادبی خدمات اور اودھ پنچ کی مزاحمتی تحریک اور اکبر الہ آبادی کی ظرافت کی تفصیلات درج کی ہیں، اس باب کے عنوانات میں، ٹھہرے پانی میں پتھر، افکارِ نو کے پرچم، سرسید احمد خاں، سرسید بطور تاریخ شناس، تہذیب الاخلاق، ردِ عمل، اکبر الہ آبادی، نئی اصناف کی کونپلیں، سرسید کے نامور رفقائے کار، شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، شمس العلماء خان بہادر مولانا نذیر احمد، پہلا ناول نگار کون؟، نشتر، خطِ تقدیر، شمس العماء مولانا محمد

حسین آزاد، جنون، انجمن پنجاب، رومانیت کا آغاز، محمد اسمٰعیل میرٹھی، دوکا کوروی شامل ہیں۔

باب نمبر ۱۵۔ ادب اور پنجاب: پنجاب کے ادبی منظر نامے پر مشتمل اس باب میں اردو اور پنجابی زبان کے تال میل، پنجاب میں نمو پانے والے اردو ادب، پنجابی شعر و ادب، پنجاب میں مشاعروں کی روایت اور اقبال کی ان میں شمولیت کا حال درج ہے اس کے ذیلی عنوانات میں لفظ کا سفر، دبئی، پنجابی VS اہلِ زبان، ہیر اور اہلِ زبان، پنجابی غزل، پنجاب فکشن کے آئینہ میں، لاہور میں مشاعرے، پنجابی مشاعرے، مشاعروں کی مقبولیت اور انحطاط شامل ہیں۔

باب نمبر ۱۶۔ مرثیہ عہد بہ عہد: مرثیہ: مقاصد و محرکات، مرثیہ: نفسی اساس، مرثیہ: ذاتی اور اجتماعی، شہادتِ امام حسینؑ، مرثیہ: دکن میں، کربل کتھا، پہلا مرثیہ نگار کون؟، عزاداری رسوزخوانی، مرثیہ شمالی ہند میں، سودا بطور مرثیہ نگار، مرثیہ لکھنؤ میں، انیس: عروسِ سخن کی مشاطگی، مرزا دبیر، مرثیہ اور خانوادۂ انیس، جدید مرثیہ، کیتھارسس: مرثیہ کا نفسیاتی وصف اور ہندو مرثیہ گو اس باب کے عنوانات ہیں، یہ باب ہندوستان میں مرثیہ نگاری کے آغاز سے تا حال تک کے منظر نامے پر مبنی ہے۔

باب نمبر ۱۷۔ اردو ڈرامہ: اس باب میں مصنف نے ڈرامے کی تعریف اور برِصغیر میں ڈرامے کے آغاز و ارتقاء پر بحث کی ہے، باب میں شامل عنوانات درج ذیل ہیں۔

شکنتلا۔ اردو میں پہلا ڈرامہ، اولیت کا تاج، واجد علی شاہ۔۔ پہلا ڈرامہ نگار، رہس، امانت کی اندر سبھا، تھیٹر بنگال میں، بیمار بلبل، تھیٹر بمبئی میں، تھیٹر بلوچستان میں، پارسی اور تھیٹر، پہلا پیشہ ور ڈرامہ نگار: آرام، طالب بنارسی، احسن اور بے تاب، رونق کا ڈرامہ، سرسید کا ڈرامہ، آغا حشر کاشمیری، قدیم سٹیج، انارکلی، ادبی ڈرامہ، ترقی پسند ڈراما، ٹیلی ویژن ڈراما اور ڈراما۔۔ جگتوں کے بھنور میں۔

باب نمبر ۱۸۔ عبوری دور کا ادب: یہ باب اردو ناول نگاری کی روایت کے آغاز و ارتقاء، اردو تنقید و تحقیق، مزاح نگاری، اور شعری جدت و تغیرات سے متعلق ہے، اس کے عنوانات میں ادبی کھاد، ناول: تاریخ سے حقیقت نگاری تک، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، رسوا، رسوا بطور شاعر، پہلی خاتون ناول نگار، لطیف موضوع رنگین اسلوب، تحقیق و تنقید، تبسم کی کرنیں، کون سا گیت سنو گی!، شاعری: فکر اور احساس کی تصویر، یگانہ اور شہر ستم گر، سانیٹ، ادبِ لطیف، نظم: مُعرّا اور آزاد، شامل ہیں۔

باب نمبر۱۹۔محرمِ رازِ درونِ میخانہ۔۔اقبال: یہ باب ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی حیات وفکر وفن اور اقبالیات پر ہونے والی قدیم وجدید تحقیقات کا احاطہ کرتا ہے،مصنف نے اس باب میں نقشوں کی مدد سے اقبال کی فکر اور ان کے شجرۂ نسب کی وضاحت کی ہے،اس باب کے ذیلی عنوانات میں،میری تمام سرگزشت،اقبال کا شجرۂ نسب،مرا طریق امیری نہیں،سیاسی سرگرمیاں،پیامِ اقبال،بڑا داغ؟،غزل:نئی جہت،افکارِ تازہ سے جہانِ تازہ،شخصیت:کلام کے آئینہ میں،فن اور اسلوب،اقبالیات کی نصف صدی،(پاکستان میں)،مدح سرائی،متنازعہ شخصیت،اقبال شناسی،اقبالیات کی درجہ بندی،اقبال:تحقیق،تراجم،شرح،اقبال ممدوحِ عالم، تصانیفِ اقبال شامل ہیں۔

باب نمبر۲۰۔ترقی پسند ادب:مصنف نے اس باب میں،آغاز،ترقی پسند اور سیاست،تخلیقی مقاصد،جل بجھے انگارے،جنس اور تخلیقی شعور،احتجاج احتجاج،ترقی پسندوں کا ہراول:پریم چند،افسانہ اور عصری شعور،ناول: زندگی کی عکاسی،خاکہ نگاری،شاعری:کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں،تنقیدی اور تخلیقی روّیے،ردِعمل،حلقۂ اربابِ ذوق،خاتمہ نام کے عنوانات قائم کیے ہیں،یہ باب ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقاء،ادبی ہنگاموں،ترقی پسندوں کا سیاست میں عمل دخل،ترقی پسند تحریک کے زوال اور حلقۂ ارباب ذوق کے ۷۸ سالہ سفر کی روداد پر مشتمل ہے۔

باب نمبر۲۱۔اردو صحافت اور ادبی جرائد:ڈاکٹر سلیم اختر نے اس باب میں ہندوستانی صحافت کی تعمیر و ترقی میں انگریزوں کے کردار،صحافت کی تاریخ وترقی،مغربی ممالک میں اردو اخبارات کی نشر واشاعت،حکومت کا صحافت پر جبر وتسلط،پاکستانی صحافت،قدیم وجدید اخبارات اور ادبی وعلمی جرائد،پنجاب اور کراچی میں صحافت کی ترقی اور صحافت کی ترقی میں مولوی عبدالحق کی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔عنوانات میں،صحافت کا اولین مرکز،کلکتہ،قلعۂ معلیٰ کا اخبار،دہلی اردو اخبار،صحافت پنجاب میں،کچھ اور اردو اخبارات،چھاپا خانہ،مغرب میں اردو اخبار،تُرکی میں اردو صحافت،اردو اخبارات اور حکومت،جنگِ آزادی اور اردو اخبارات،صحافت پابند،اردو صحافت اور ادب،گلدستہ،قدیم VS جدید،تہذیب الاخلاق،اودھ پنچ،اودھ اخبار،پنچوں کی گرم بازاری،عصر نما، دلگداز،زمانہ،اردوئے معلیٰ،نگار،ساقی،ترقی پسند ادب کے ترجمان جریدے،خواتین کے ادبی جرائد،سرحد کا پہلا اخبار اور ادبی جرائد،ادبی جرائد کا مرکز لاہور،مخزن،امتیاز علی تاج کا خانوادہ،ہمایوں،عالمگیر،نیرنگِ خیال،

ادبی دنیا، کارواں، شیرازہ، ادبی جرائد قیامِ پاکستان کے بعد، کراچی کے ادبی جرائد، اردو اور مولوی عبدالحق، ہندوستان کے ادبی جرائد شامل ہیں۔

باب نمبر۲۲۔ پاکستان میں اردو ادب کی نصف صدی: قیامِ پاکستان، تقسیم کے بعد پاکستان میں استوار ہونے والے ادبی ماحول، تحاریک، نظم ونثر کی جدید اصناف اور ادبی تنقید وتحقیق کی صورتِ حال پر مبنی اس باب کے ذیلی عنوانات، پاکستان: تاریخ کا معجزہ، معجزہ اور ردِ عمل، ترقی پسند ادب کی تحریک، آئینِ نو بمقابلہ طرزِ کہن، پاکستان: فکری مباحث، ادب میں جمود، ترقی پسند بمقابلہ غیر ترقی پسند، ادب میں کمٹمنٹ، ادبی شیروں اور بکریوں کا گھاٹ، زبان کا بت اور پاکستانی محمود غزنوی، نثر + نظم = نثری نظم، شاعری کا جاپانی پھل، سدا بہار شجر شعر، حمد، نعت، مرثیہ، چند بیبیاں، بدیشی باغوں میں اردو کی مہک، دیگر اصناف، متبسم تحریریں، ترقی پسند افسانہ اور اس کے بعد، احمد ندیم قاسمی، علامت اور شعور کی رو، نمائندہ افسانے، تحقیق وتنقید، اور آخری بات ہیں۔

باب نمبر۲۳۔ پاکستان میں اردو نثر کا تخلیقی منظر نامہ: فکشن: پس منظر اور پیش منظر، تناظر، اصلاح، تاریخ اور تاریخی ناول، لکھنؤ کا میلہ، لکھنؤ کا آئینہ، پاکستان میں ناول، بستی، تکنیک میں تنوع، ناولٹ، زنانہ ادب، خوف، سسپنس، جین ڈکسن کا کرسٹل، پاکستانی افسانہ: شناخت کا عمل، اجتماعی شعور اور افسانہ، مقصودِ فن، افسانہ اور قاری، علامت/استعارہ، سبک منٹو، افسانہ کا افسانہ، طنز ومزاح، افسانہ کدھر، خاکہ نگاری، اردو کے مسافر ادیب، انشائیہ کا سیاپا، خودنوشت سوانح عمری، منفرد نثر نگار، بچوں کا ادب اس باب کے عنوانات ہیں، مجموعی طور پر اس باب میں مصنف نے پاکستان میں نمو پانے والی تمام نثری اصنافِ ادب کا احاطہ کیا ہے، انشائیہ کا سیاپا کے عنوان کے تحت ڈاکٹر سلیم اختر نے انشائیہ کے آغاز کے بارے میں ہونے والی تحقیقات پر اہم گفتگو کی ہے گو کہ وزیر آغا کے حوالے سے ان کے بیان میں ان کی معاصرانہ چشمک کا رنگ غالب نظر آتا ہے، اس بارے میں لکھتے ہیں۔

> ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے جملہ ذرائع ابلاغ استعمال کرتے ہوئے انشائیہ کی بحث کو یوں ہی الجھا دیا ہے اور مختلف انشائیہ نگاروں (جیسے مشکور حسین یاد) کی یوں کردار کشی کی ہے کہ انشائیہ کی اصطلاح ایجاد کرنے کا تاج اپنے سر سجانے کا موقع مل جائے۔۔۔جس زمانہ (1957) میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریریں ''ادبِ لطیف'' میں ''نثر لطیف''، لطیف پارہ یا خیالیے کے عنوان سے چھپتی تھیں اور وہ ہنوز لفظ انشائیہ سے نا آشنا تھے تو اس سے پہلے

کہیں 1944ء میں سید علی اکبر قاصد کے انشائیوں کا مجموعہ ''ترنگ'' پٹنہ سے شائع ہو چکا تھا۔اس کا تعارف کلیم الدین احمد اور دیباچہ اختر اورینوی نے لکھا تھا۔ 102 صفحات پر مشتمل یہ کتاب گیارہ انشائیوں پر مشتمل ہے۔اختر اورینوی نے اپنے دیباچہ کا آغاز ان سطور میں کیا ہے۔اردو ادب میں انشائیوں (Essay) اور خاکوں کی بڑی کمی ہے۔کبھی کبھار کوئی اچھا انشائیہ پرچوں میں نکل آتا ہے تو دو گھڑی جی بہل جاتا ہے''۔۔۔ان دو ٹوک شواہد کی روشنی میں ڈاکٹر وزیر آغا کو کیسے اس صنف یا اصطلاح کا موجد تسلیم کیا جا سکتا ہے۔(۱۵)

باب نمبر۲۴۔ پاکستان میں تحقیق وتنقید: پاکستان کے ادبی ناقدین اور محققین کی خدمات، تحقیق، تنقید اور تخلیق کے باہمی ربط اور پاکستان میں جامعاتی سطح پر ہونے والی تحقیق سے متعلق اہم مباحث اس باب کا حصہ ہیں، ڈاکٹر سلیم اختر جامعات میں ہونے والی ادبی تحقیق وتنقید سے مطمئن نہیں ہیں، ان کے خیال میں ڈگریوں کے حصول کے لیے لکھے جانے والے مقالات میں تحقیق وتنقید کے عناصر مفقود ہیں۔عنوانات میں تخلیقی مد و جزر، تنقید و تحقیق، فلسفہ اور تنقید کی مکھیاں، تحقیق: حق بہ حقدار، تحقیق کے مردِ میدان، یونیورسٹی اور تحقیق، ڈاکٹریٹ اور تحقیق، ڈاکٹر فیض احمد فیض، پھول جمع کرنے والے، تنقید میں تنوع، اقبال اور اقبال شناس، اردو تنقید نگاہ بازگشت، تنقید ترقی پسند، محمد حسن عسکری، فکر ونظر کا تنوع، نفسیات اور لاشعور، پروفیسر نقاد، مغرب سے استفادہ، اور تنقید کدھر شامل ہیں۔

باب نمبر۲۵۔ پاکستان میں شعر کی صورتِ حال: ۱۹۴۷ء سے حال تک کی پاکستانی شعریات سے متعلق اس باب میں مصنف نے اردو کی عمومی شاعری، مزاحیہ شاعری، مرثیہ اور دوہا سے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہیں اور شعراء کا نمونہ کلام بھی دیا ہے، اس باب کے ذیلی عنوانات میں، ترقی پسند شعراء، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، فکر و احساس کا تنوع، اظہار واسالیب کے نئے امکانات، کوچۂ سخن، شعراء اور تخلیقی روّیے، ہنستے مسکراتے الفاظ، عصری صورتِ حال کا استعارہ، مرثیہ، دوہا نگر، پنگل، دوہے کا مزاج، آغاز، دوہا پاکستان میں، شامل ہیں۔

باب نمبر۲۶۔ جوہر عورت کی نمود: اس باب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو ادب میں خواتین کے کردار کے حوالے سے بات کی ہے خاص کر خواتین شاعرات، اور خواتین کے جرائد سے متعلق اہم معلومات اس باب کا

حصہ ہیں،اس کے علاوہ شاعرات کا نمونہ کلام بھی دیا ہے۔قلم یا چابک،طوائف بطور تخلیق کار، ذرا سی آبِ جو، تعلیم اور ذہنی بیداری، خواتین کے جرائد، جادہ تراشی، پاکستانی شاعرات، دیگ کے چاول، بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں،شاعری یا تصویر، تجھ کو بھی ادا جرأتِ گفتار ملی تھی، مینا بازار،عورت جنس اور جذبات،اس باب کے عنوانات ہیں۔

باب نمبر ۲۷۔ نئے رجحانات،تصوراتِ نو،نزاعی مباحث: اس باب میں بھی زیادہ تر پاکستان کی شعری صورتِ حال کے مباحث شامل ہیں، ہئیت کے جدید تجربات، ہائیکو، اور نثری نظم کے حوالے سے جدید دور کے شعراء کا ذکر اور نمونہ کلام اس باب کا حصہ ہیں، آخر میں افسانہ کے جدید رجحانات اور ادب کے مزاحمتی روّیوں سے متعلق کچھ تنقیدی تجزیے بھی دیے گئے ہیں، اس باب کے عنوانات میں عہدِ کلیات، شاعری علامت سے گھر تک، چل اے خامہ کراچی، شعر کی چل رہی ہے پن چکی، خوش درخشید، الگ تھلگ، لفظ کی دھار، تنہا ستارے، اینگری ینگ مین: پاکستانی اسٹائل، بے ربطی میں ربط، نثری شاعری، افسانہ علامتی اور تجریدی، مزاحمتی روّیہ اور بائیں بازو کے اہلِ قلم، قومی جمالیات، اور گمشدہ استعارہ، شامل ہیں۔

باب نمبر ۲۸۔ظرافت کا لحاف۔۔۔میڈان پاکستان: یہ باب طنز ومزاح کے آغاز وارتقاء قدیم وجدید رجحانات اور پاکستانی ادب میں مزاح نگاری کی روایت سے متعلق ہے، مزاحیہ شعراء کا نمونہ کلام بھی دیا گیا ہے، ذیلی عنوانات، مزاح، طنز، لطیفہ اور کیتھارسس، شیر وشکر، طنز ومزاح فنی محرک، سرسید تحریک، ردِ عمل، اودھ پنچ، ظریفانہ جرائد، فتنہ عطر فتنہ، ظریفانہ شاعری کا معلم اکبر الہ آبادی، طنز ومزاح کے نئے اہداف، چند مزاح نگار، ترقی پسند مصنفین اور طنز ومزاح، طنز ومزاح میں تنوع، شاعری میں طنز ومزاح ہیں۔

باب نمبر ۲۹۔ معاصر تخلیقات کا جھروکہ: یہ باب ۱۹۹۰ء تک مختلف ایڈیشنوں کے لیے لکھے گئے ضمیمہ جات پر مشتمل ہے، جنھیں ایک ہی باب میں ضم کر دیا گیا ہے، اس باب میں ۹ ضمیمے اور ''۱۹۹۹ء الوداع'' کے نام سے ایک اضافی عنوان کے تحت بیسویں صدی کی ادبی صورتِ حال کا مختصر ادبی جائزہ پیش کیا گیا ہے کتاب کا خاتمہ آخری بات کے عنوان سے مصنف نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''تنبیہ الغافلین۔۔۔اس کتاب کا مطالعہ ادب کے بارے میں کچھ جانکاری کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ اپنا نام دیکھنے کے لیے''(۱۶)

ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ کتاب چند ایک خامیوں کے ساتھ ایک اہم ادبی تاریخ کہلائی جانے کی مستحق ہے، کیونکہ اس کتاب میں کم وبیش تمام قدیم وجدید ادبی مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے، چند ایک اعتراضات جن کا پہلے محققین ادب کے بیانات کی روشنی میں ذکر کیا جا چکا ہے کے علاوہ اس کتاب میں ایک مسئلہ یہ بھی درپیش ہے کہ کتاب کے اوراق کو مصنف کے طویل تنقیدی مباحث نے بوجھل کر دیا ہے جن میں کئی ایک بار بار دہرائے بھی گئے ہیں اور درحقیقت کتاب کے حجم میں بے پناہ اضافے کی وجہ بھی یہی تنقیدی مضامین ہیں۔

ی۔ ڈاکٹر سلیم اختر بطور محقق:

یوں تو ڈاکٹر سلیم اختر نے شاعری کے علاوہ اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے، تنقید، افسانہ نگاری، تحقیق، تاریخ نویسی، آپ بیتی، سفرنامہ نگاری، خاکہ نگاری، عمومی نفسیات، طنز ومزاح، سوانح عمری اور نصاب کے لیے لکھی گئی ان کی کل کتب کی تعداد سو کے قریب جا پہنچتی ہیں، لیکن بنیادی طور پر ڈاکٹر سلیم اختر نقاد اور افسانہ نگار ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایک پیدائشی نقاد ہیں، ان کی تنقید اور افسانہ نگاری کا آغاز اوائل عمری سے ہی ہوتا ہے جب انہوں نے ۱۹۴۷ء میں بچوں کے ایک رسالے کے لیے ایک کہانی ''ایماندار مصور'' اور آٹھویں جماعت میں اقبال اور میر پر مضامین لکھے، ان کے ابتدائی مضامین عامیانہ سطح کے سہی لیکن تنقید کی طرف ان کی طبیعت کے فطری میلان کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ بعد کے زمانے میں ان کا جھکاؤ نفسیاتی تنقید کی طرف زیادہ ہوا اور یہی موضوع ان کی پہچان کا باعث بنا۔ افسانے بھی تواتر سے لکھتے رہے، ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں، ادبی تاریخ نویسی اور تحقیق کے حوالے سے بھی ان کی خدمات قابل قدر ہیں، انھوں کے تحقیق کے میدان میں اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، اردو زبان کیا ہے، تنقیدی اصطلاحات، انشائیہ کی بنیاد، اور اقبالیات و غالبیات، پر کئی ایک اہم کتابیں لکھیں، تحقیقی تحاریر میں بھی ان کا اسلوبِ بیان انشائی اور افسانوی رنگ لیے ہوتا ہے۔

معاصر ادب کے بارے میں ان کی تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اردو لسانیات اور اردو زبان وادب کے جدید مباحث وتحقیقات میں خصوصی دلچسپی کے باعث ان کی اکثر تحقیقی وتنقیدی تصانیف ارتقائی عمل میں گرفتار نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر سال بہ سال کے بدلتے ادبی منظر نامے سے نہ صرف خود آگاہ رہتے ہیں بلکہ اپنی

کتابوں کو اپ ٹو ڈیٹ رکھ کر اپنے مطالعے میں قاری کو بھی شریک رکھتے ہیں، اور ان کی یہی روش ان کی تصانیف کی مقبولیت کا باعث ہے۔ پیدائشی نقاد ہونے کی وجہ اکثر تحقیقی امور میں بھی وہ تنقیدی رو میں بہتے چلے جاتے ہیں اور تخلیق اور تخلیق کار کے نفسیاتی ربط کی تشریحات کے فرائض بھی سرانجام دیتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اکثر اوقات ان کے تحقیقی مضامین بے جا طوالت کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کو ایک ایسی ہی مثال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ معاصر ادب کی تحقیقات میں کانٹ چھانٹ ان کی تحقیقی روش کا ایک خاص پہلو ہے جس کی وجہ سے بعض محققین ان کی آراء کو غیر مستحکم قرار دیتے ہیں ان کی تحریروں میں معاصرانہ چشمک کے اثرات بھی نمایاں نظر آتے ہیں اور وہ خود بھی اس بات کے معترف ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید کے ساتھ ان کی معاصرانہ چشمک مشہور رہی اور دونوں اطراف سے ایک دوسرے پر برابر حملے ہوتے رہے، گو کہ وہ اب اس سے دستبرداری کا اعلان کر چکے ہیں لیکن اب یہ چشمک بھی اب ان کے ادبی سفر کا لازمہ بن چکی ہے، ان کی تحریروں میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے جس کی وجہ سے اکثر محققین نے ان پر اعتراض بھی کیا ہے، مجموعی طور پر ڈاکٹر سلیم اختر ایک مستقل مزاج، محنتی اور حاضر باش قسم کے ناقد اور محقق ہیں، ادبی حالاتِ حاضرہ کے متعلق ہمیشہ خبردار رہنے والے اور اپنے کام کو بہتر سے بہتر بنانے کی سعی کرنے والے، انھیں بجا طور پر اردو ادب کا سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ پوری عمر انھوں نے اس کی خدمت میں صرف کر دی۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۰

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، پہلا ایڈیشن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۱ء، ابتدائیہ

۳۔ ایضاً، ص ۱۴۔۱۵

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۴۔۱۳

۵۔ ایضاً، ص ۴۱۵

۶۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، اردو کی ادبی تاریخیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۸۹۳

۷۔ ایضاً، ص ۹۴۔۸۹۳

۸۔ جلیل اشرف، ڈاکٹر، ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیتِ نقاد، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۹

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو اردو بازار لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۶۸۱

۱۰۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۸۳۔۸۴۔۸۵

۱۱۔ روش ندیم، ڈاکٹر، تبصرہ، ادبی تاریخ نویسی، مشمولہ "معیار" انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، شمارہ ۵، جنوری تا جون، ۲۰۱۱، ص ۴۳۷

۱۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۳۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۴۔ ایضاً،، ص ۸۱

۱۵۔ ایضاً،، ص ۵۳۹۔۵۳۸

۱۶۔ ایضاً،، ص ۱۳۷

باب چہارم

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: تنقیدی جائزہ

ا۔ تاریخ نگاری کے رجحانات

ب۔ بنیادی ڈھانچہ

ج۔ اسلوب

د۔ تنقیدی زاویہ

ہ۔ فکری زاویہ

و۔ تاریخ نویسی کے اصول اور مصنف کے نجی رجحانات

ز۔ فکشن کی تاریخ و تنقید

ح۔ شاعری کی تاریخ و تنقید

چوتھا باب

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: تنقیدی جائزہ

ا۔ تاریخ نگاری کے رجحانات:

اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی روایت میں جو مختصر اور بسیط تواریخ شامل ہیں ان پر ناقدین اور محققین گاہے بہ گاہے اپنی آراء پیش کرتے رہتے ہیں، بعض ناقدین ان تواریخ کے محاسن و معائب کی نشاندہی کرتے ہیں تو بعض ان کو سرے سے ادبی تواریخ ماننے سے ہی انکار کرتے ہیں، ناقدین کو عموماً اردو کے ادبی مؤرخین سے تعصب، غیر سائنسی اندازِ تحقیق، تاریخی تسلسل کی کمی اور محدود تاریخی تصور جیسے مسائل پر شکایت رہی ہے۔ جدید دور کے ادبی مورخین نے ان مسائل کو مدِ نظر رکھ کر ادبی تواریخ قلمبند کرنے کی سعی کی ہے، ادبی تاریخ نویسی کے جدید رجحانات کے تحت لکھی جانے والی ادبی تورخ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردو، تبسم کاشمیری کی اردو ادب کی تاریخ، وہاب اشرفی کی تاریخِ ادبِ اردو سیدہ جعفر اور گیان چند جین کی تاریخ ادبِ اردو، ڈاکٹر انور سدید کی اردو ادب کی مختصر تاریخ اور ڈاکٹر سلیم اختر کی اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ قابل، ذکر ہیں۔ ان مورخین نے ادبی تاریخ نویسی کی روایت میں تنقیدی شعور، تاریخی تسلسل، تحقیق کا سائنسی طریقہ کار، اور تاریخ نویسی کے وسیع تصور کو ادبی تاریخ نویسی کا حصہ بنا کر اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی روایت میں جدت پیدا کرنے کی سعی کی، اس کے علاوہ بعض اداروں کی طرف سے ایسی تواریخ لکھی گئی جن کی تکمیل میں ایک سے زیادہ مورخین نے حصہ لیا لیکن ایسی تواریخ متنازعہ ثابت ہوئیں اور محققین اور ناقدین نے ان تواریخ کو نامکمل، تاریخیت کے تسلسل سے عاری مضامین قرار دیا۔ چند ایک مثالوں میں ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند'' پنجاب یونیورسٹی پاکستان، اور ''علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو'' علی گڑھ یونیورسٹی، بھارت شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اور تاریخ ادبِ اردو: ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۴ جلدوں پر مشتمل ادبی تاریخ تاریخ

ادبِ اردو کے نام سے لکھی جو جدید دور کی ادبی تاریخ نویسی کی روایت میں ایک بڑا کارنامہ قرار پائی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں اردو کے علاقائی ادب کی منقسم روایتوں کو ایک ہی لڑی میں پرو کر قاری کے سامنے پیش کیا، مصنف نے ایسے ماخذات تک براہ راست رسائی حاصل کر کے انھیں ادبی منظر نامے میں پھر سے زندہ کر دیا جو اپنے زمانوں میں تو مشہور رہے لیکن افتادِ زمانہ کے ہاتھوں معدوم ہو کر رہ گئے ماہر لسانیات ہونے کے ناطے انھوں نے اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء کے حوالے سے ہندوستان کی لسانی تحقیقات کے نتیجے میں مختلف علاقوں کی اردو زبان کی نمائندگی کو تسلیم کیا ہے جس پر رشید حسن خان اور دیگر احباب نے اعتراضات اٹھائے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی تاریخ کا سب سے بڑا وصف ان کا غیر جانبدارانہ رویہ اور تحقیق اور تنقید میں توازن ہے مصنف نے بے جا تنقیدی مباحث سے گریز کیا ہے اور جہاں تنقید کی ضرورت پڑی وہاں پوری وضاحت کے ساتھ تنقیدی بحث کی ہے، مجموعی طور پر ان کی تاریخ اردو ادب کی اب تک کی اہم اور مستند ترین تاریخ قرار دی جا رہی ہے۔ کتاب کی جلدِ اول کے پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> جدید ادب کی طرح قدیم ادب بھی مخصوص تہذیبی، معاشرتی، معاشی، سیاسی و لسانی عوامل کا منطقی نتیجہ تھا۔ اسی لیے اس کا مطالعہ بھی تہذیبی و معاشرتی عوامل کی روشنی میں ویسے ہی کیا جانا چاہیے جیسے آج ہم جدید ادب کا کرتے ہیں۔ ادب کی تاریخ ایک ایسی اکائی ہے جسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ خود جدید ادب کو سمجھنے کے لیے قدیم ادب کا سمجھنا ضروری ہے۔ ادب کی تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں ہم زبان اور اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی و تہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ادب میں سارے تہذیبی، فکری، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت ایک اکائی بناتے ہیں اور تاریخ ادب ان سارے اثرات، رویات، محرّکات، اور خیالات و رجحانات کا آئینہ ہوتی ہے۔ میں نے اسی شعور اور نقطہ نظر سے قدیم ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ اب تک جتنی ادبی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں مختلف علاقوں کا قدیم اردو ادب الگ الگ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا یہ سب الگ الگ جزیرے ہیں جن کے ادب و زبان کے مطالعے کا مجموعی نام تاریخ ادب رکھا گیا ہے۔ میرے لیے یہ بات

قابلِ قبول نہیں تھی کہ گجرات، دکن اور شمال کا ادب الگ الگ جزیروں کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک کا تعلق دوسرے سے کچھ نہیں ہے۔ جب میں نے قدیم ادب کا براہِ راست مطالعہ کیا تو اثرات و روایات کا ایک ایسا سلسلہ نظر آیا جو ایک دوسرے سے پوری طرح پیوست تھا۔ یہ تحقیق کی ایک نئی صورت تھی۔ اس اندازِ نظر نے اس تصنیف کو وہ صورت عطا کی، جو آپ کے سامنے ہے۔ اس میں مطالعہ، تحقیق، فکر اور طرزِ ادا سب مل کر ایک ہو گئے ہیں۔(۱)

تبسم کاشمیری: ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ادبی تاریخ اردو ادب کی تاریخ کے نام سے ۲۰۰۳ء میں منظرِ عام پر آئی۔ مصنف نے اپنی ادبی تاریخ کی بنیاد فرانس "Annales school" کے نظریہ تاریخ کے اصولوں کی روشنی میں استوار کی "Annales school" فرانس کے مورخین نے تاریخ کو محدود کلاسیکی نظریات اور پابندیوں سے آزادی دلا کر اس میں وسعت پیدا کی، اس دبستان کے بانیوں نے سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی امتزاج اور سارے عہد کے مطالعے اور تجزیے سے انسانی نفسیات کو پرکھتے ہوئے تاریخ لکھنے پر زور دیا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اسی دبستان کے زیرِ اثر اپنی ادبی تاریخ میں سماجی تاریخ کے ساتھ دیگر علوم وفنون کے مطالعے کے ذریعے ادبی وقوعات کی چھان بین میں مدد لینے کی کوشش کی تا کہ انسانی نفسیات، اجتماعی شعور اور اس کی کارفرمائی کا صحیح ادراک ہو سکے۔ مصنف نے اپنے اسلوب کو جاندار بنانے کے لیے تخیلاتی صلاحیتوں سے بھی مدد لیتے ہوئے واقعات کی ترتیب میں حرکت اور رعنائی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے شخصیات کے مرکزی کردار کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے اردگرد کے پھیلتے ہوئے تہذیبی تغیرات کے تحت ادبی تاریخ کا نقشہ تیار کیا ہے۔

وہاب اشرفی: ڈاکٹر وہاب اشرفی ادبی تاریخ نویسی کا ایک معتبر نام ہے ان کی مشہور کتاب تاریخ ادبیاتِ عالم ایک اہم علمی اور ادبی خزانہ ہے انھوں نے تاریخ ادب اردو کے نام سے تاریخ نویسی کے جدید نظریات ورجحانات کے تحت اردو کی ادبی تاریخ قلمبند کی، یہ کتاب تین بسیط جلدوں پر مشتمل ہے جو ۲۰۰۷ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی کے زیرِ اہتمام مطبع ''عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی سے شائع ہوئی اس کتاب میں مصنف نے اردو زبان کے آغاز سے لے کر ۲۰۰۰ء تک سکے ادبی منظر نامے کا احاطہ کیا ہے اس کتاب کا

انتساب اردو ادب کے معروف مورخ ''ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام ہے، ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اپنی ادبی تاریخ میں ادبی وقوعات اور شخصیات کے ساتھ ساتھ ادب پر اثر انداز ہونے والے سیاسی اور سماجی حالات و واقعات کا بھی تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے ابواب زمانی اعتبار سے قائم کیے گئے ہیں مصنف نے جدید علمی اور ادبی رجحانات کے تحت ادبی منظرنامے پر روشنی ڈالی ہے، ڈاکٹر وہاب اشرفی اپنی کتاب کے ابتدائیے میں اردو کی ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> یہ بات اہم سہی لیکن تسامحات، اغلاط، دانستہ فریب کاری، بیانات میں غلو، خواہ مخواہ کی طوالت، نئے تحقیقی انکشافات سے بے خبری وغیرہ کسی بھی تاریخ کو ناقص ثابت کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ گزشتہ پچاس برسوں میں نئی تحقیقات کا ایک بیش بہا خزانہ اکھٹا ہو گیا ہے۔ تذکروں کے اغلاط کی تصحیح کا کام سرانجام پاتا رہا ہے۔ بعض بے حد اہم شاعروں کی زندگی کا احوال اور خود ان کے کلام کے بہت پیچیدہ مسائل حل ہو چکے ہیں اور بعض حل ہونے جا رہے ہیں۔ اگر آج کا ادبی مورخ ان سے صرفِ نظر کرنا چاہے تو کر نہیں سکتا۔ ایک دشواری ضرور ہے کہ ایک محقق دوسرے محقق کے کام کو رد کرتا بھی نظر آتا ہے اس کے پاس اپنے دلائل ہوتے ہیں۔ اب تاریخ لکھنے والے کا کام ہے کہ وہ اپنی بصیرت، قوتِ تحلیل اور علمی وژن کو کام میں لائے اور کسی آخری فیصلے پر پہنچ جائے یا پھر بصورتِ دیگر متنازع امور کو اس طرح پیش کرے کہ پڑھنے والا اپنی بصیرت کو متحرک رکھ سکے اور کسی نتیجے پر مرتکز ہو سکے۔ جمیل جالبی کے ہاں یہ شعور بہ درجہ اتم موجود ہے، گیان چند جین اور سیدہ جعفر کی تاریخوں میں بھی یہ کیفیت نمایاں ہے۔ تبسم کاشمیری کے یہاں تحلیلی اور تجزیاتی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ (۲)

ڈاکٹر ضیاء الحسن: ڈاکٹر ضیاء الحسن نے اپنے ایک مضمون ''ادبی تاریخ نویسی میں تاریخی شعور کی اہمیت'' میں عام انسانی تاریخ اور ادبی تاریخ کے باہمی ربط کی وضاحت مختلف مغربی مورخین کی تحقیقات اور نظریات کی روشنی میں کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ ادبی تاریخ عام انسانی تاریخ کا ایک لازمی حصہ ہے، انسانی تاریخ کی ترتیب میں ادبی تاریخ کی مختلف اصناف، ناول، افسانہ، سوانح عمری اور شاعری سے مدد لی جاتی ہے۔ ان کے

خیال میں ادبی مؤرخ کے لیے تاریخی شعور کے لوازمات سے واقفیت بے حد ضروری ہے اس بابت اپنے مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

> ادبی تاریخ نویسی ایک پیچیدہ عمل ہے جس کی فہم مؤرخ کی تاریخی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں ایسا شخص ادبی مورخ نہیں ہوسکتا جو محض ادب کا ذوق رکھتا ہو اور سماجی عوامل کو سمجھنے کی بصیرت سے محروم ہو یا سماجی تعامل کو سمجھتا تو ہو لیکن ادب اور سماج کے باہمی رشتے قائم کرنے کا شعور نہ رکھتا ہو۔ تاریخ ادب محض ادیبوں کی سوانح حیات نہیں ہے اور نہ محض فن پاروں کی ادبیت کا گوشوارہ ہے بلکہ شعر و ادب ایسی داستان کا ارتقاء ہے جو اپنے اندر غیر مختتم تحرک اور فعالیت کو سمیٹے ہوئے ہے جس میں ادب، اسلوب، تخلیق کار، معاشرہ اور قاری ایک ایسے نامیاتی کُل میں ڈھل جاتے ہیں جہاں ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ مؤرخ کے لیے اس پیچیدہ ترکیب کا شعور ناگزیر ہے (۳)

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر سلیم اختر: ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کا موقف یہ ہے کہ ادبی مورخ کو کسی مخصوص تنقیدی رجحان یا دبستان کے تحت ادبی تاریخ لکھنی چاہئے۔ اسی طرح ان کے نظریے کے مطابق ادبی تاریخ کو تنقیدی اسلوب میں لکھنا چاہیے۔ انہوں نے اپنی کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں اسی طریقہ کار کو روا رکھتے ہوئے ادبی تاریخ کی تشریح و تاویل میں نفسیاتی تنقید کو عملی صورت میں تخلیق اور تخلیق کار کی جانچ پڑتال کے لیے آلہ کار بنایا ہے، ڈاکٹر سلیم اختر سے پہلے بھی چند نقادوں نے اردو ادب کی تخلیقات اور تخلیق کاروں کو نفسیاتی تنقید کے اصولوں پر پرکھنے کی کوشش کی ہے لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نے پہلی مرتبہ اردو کی ادبی تاریخ میں نفسیاتی تنقید کو وقوعات، شخصیات اور تخلیقات کو پرکھنے کا آلہ بنایا۔ تبسم کاشمیری کا نظریہ تاریخ بھی اسی نظریے سے ملتا جلتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ تبسم کاشمیری نے تاریخ ادب کے دائرہ کار کو وسعت دے کر دیگر معاون علوم تک پھیلایا۔

ب: بنیادی ڈھانچہ

کسی بھی کام کو احسن طریقے سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پہلے اس کی جزیات کا خاکہ یا ڈھانچہ مرتب کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ کام تواتر سے بغیر کسی رکاوٹ کے مکمل ہو سکے، جدید ٹیکنالوجی کی صنعت ہو یا

تعمیراتی منصوبے ہوں ہر کام کے آغاز سے پہلے اس کی حدود اور امکانات، مسائل ومشکلات اور مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر اس کا خاکہ تیار کیا جاتا ہے بنیادی ڈھانچے کی تیاری کے بغیر کسی بھی کام کے آغاز اور اس کی تکمیل احسن طریقے سے نہیں ہوسکتی۔ تصنیف وتالیف کے سلسلے میں بھی خاکہ مرتب کرتے وقت مصنف اپنے موضوع کے متعلق تمام تر معاملات کا جائزہ لیتا ہے، مواد اور ماخذات کی معلومات حاصل کرتا ہے اور پھر اسے قلمبند کرنے کا ایک بنیادی ڈھانچہ یا طریقہ کار وضع کرتا ہے، اور اسی پر چلتے ہوئے اپنی تحاریر کو کتابی صورت میں یکجا کرتا ہے، خاکہ کلی طور پر حتمی نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات حسبِ ضرورت اس کی جزیات میں رد وبدل بھی کیا جاتا ہے اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ '' کا ابتدائی خاکہ ایک رسالے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بنایا گیا اسی وجہ سے جب مصنف نے اس مسودے کو کتابی شکل میں مرتب کیا تو اس کی تفصیلات میں حذف واضافت سے کام لیا، اس کتاب میں ''مختصر ترین'' کے الفاظ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اور انہی الفاظ کو اس کتاب کی مخصوص ترتیب کا بنیادی کلیہ سمجھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب کا بنیادی ڈھانچہ جن ستونوں پر استوار کیا ہے ان کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے، مختصر ترین الفاظ، حتیٰ الواسع معلومات، تحقیق وتنقید کا توازن، مخصوص نظریہ نقد، اور عہدِ حاضر کا ادب۔ مصنف نے اس کتاب کے عناصرِ ترکیبی میں بھی ''مختصر ترین'' کے الفاظ کو اول درجے پر رکھا ہے۔ حتیٰ الواسع معلومات کا ذخیرہ ایک اور بنیادی وصف ہے اس معاملے میں مصنف کی تحقیقی کاوش قابل ستائش ہے کہ مختصر الفاظ میں ایک ہی جلد کے اندر اس کتاب میں وہ تمام معلومات مل جاتی ہیں جن کی ادب کے ایک طالب علم یا قاری کو ضرورت پڑتی ہے اس کتاب میں قدیم وجدید ادب کے ہر موضوع پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔

تنقید وتحقیق کا توازن بھی اس کتاب کے ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتا ہے لیکن آخری چند ایڈیشنوں میں تنقیدی مباحث کی طوالت کی وجہ سے اس توازن میں بگاڑ آ گیا ہے اور مختصر ترین کے الفاظ کی معنویت بھی معدوم ہوگئی ہے، جا بجا تنقیدی مضامین کے دخول نے اس کتاب کے حجم میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ادبی تاریخ کو کسی مخصوص نظریہ نقد کے تحت قلمبند کرنے کے حق میں ہیں اور ان کی اس کتاب میں ادبی تاریخ نویسی کا یہ تصور واضح نظر آتا ہے، مصنف نے موضوعات کی تاویل وتشریح نفسیاتی تنقید کی روشنی میں کی ہے، تخلیق کار کی نفسیات کی تشکیل کے محرکات اور اس کی نفسیات کے تخلیق پر پڑنے والے اثرات کا تجزیہ مصنف کے تنقیدی

نظریے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔اس ادبی تاریخ کی ایک اہم خصوصیت معاصر ادب کی بازیافت ہے اردوادب کی کسی بھی تاریخ میں جدید ترین ادبی موضوعات پر اتنا مواد نہیں ملتا جتنا ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ '' میں ہے۔مصنف نے نہ صرف جدید ادب کا بھرپور مطالعہ پیش کیا ہے بلکہ کلاسیکی ادب کے بارے میں ہونے والی جدید تحقیقات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے،عہدِ حاضر کی اہم ادبی تصانیف،شخصیات،نظریات ورجحانات، تحقیقات اور امکانات کے متعلق اہم مواد اس کتاب کا حصہ ہے۔بنیادی طور پر یہ کتاب جن بڑے موضوعات پر مشتمل ہے ان میں، تاریخ ادب کے تصور وارتقاء، اردو زبان کے آغاز و ارتقاء، اردو ادب کے آغاز و ارتقاء،مختلف ادبی تحریکیں۔ جدید ادب اور پاکستان میں شعروادب کی صورتِ حال شامل ہیں، ان موضوعات کو مصنف نے ۲۹ مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

تاریخ ادب تصور وارتقاء: اس موضوع پر مصنف نے کتاب کے پہلے باب میں مختصر بحث کی ہے جس میں تاریخ کی تعریف اور ادبی تاریخ کے کلاسیکی اور عالمی رجحانات اور لسانیات کے بین الاقوامی تناظر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے مصنف نے ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کے حوالے سے مختلف مورخین کے میلانات ونظریات کی روشنی میں سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ادبی تاریخ نویسی کے حوالے سے اپنے نقطہ نظر کی بھی وضاحت کی ہے،اس حوالے سے ادبی تاریخ کے لیے مخصوص نظامِ نقد کو نہایت اہم قرار دیتے ہیں۔

اردوزبان کا آغاز وارتقاء: یہ ادبی تواریخ کا ایک اہم اور پیچیدہ موضوع ہے جس پر محققین ادب اپنی دن رات کی محنت اور کوششوں سے تحریف واضافہ کرتے رہتے ہیں''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ '' میں بھی اس موضوع کا دائرہ کار خاصا وسیع ہے جس میں مصنف نے اردوزبان کے آغاز وارتقاء،اصلاحِ زبان اور اس بارے میں پیدا ہونے والے تحقیقی نزاعات کا بھرپور احاطہ کیا ہے،

اردو ادب : آغاز وارتقاء: اس موضوع پر ڈاکٹر سلیم اختر نے اصنافِ ادب ،تخلیق کاروں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں تحت بحث کی ہے جس میں اردو ادب کے آغاز ،قدیم ادبی اصناف،اور کلاسیکی عہد کے شعراء اور نثر نگاروں کا تفصیلی احاطہ کیا ہے،مصنف نے دکن ، دہلی اور لکھنؤ، میں نمو پانے والے کلاسیکی ادب کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے،اس کے علاوہ ،یورپین اردو شعراء، داستانوی ادب اور فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔

ادبی تحریکیں: اس کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اصلاح زبان کی تحریک، سرسید تحریک، اردو دب کی نشاۃ ثانیہ اور ترقی پسند تحریک کی تفصیلات الگ الگ ابواب میں خصوصیت کے ساتھ دی ہیں، جن میں اردو ادب کی جدید اصناف، ناول، نظم، مضمون، تنقید، سوانح عمری کے آغاز پر بھی بات کی گئی ہے، ردِ عمل کے طور پر سامنے آنے والے نظریات اور تحاریک کا ذکر ضمنی بحث کی صورت میں ملتا ہے مثال کے طور پر سرسید تحریک کے باب میں رومانوی تحریک پر بھی مختصراً روشنی ڈالی ہے، اسی طرح ترقی پسند تحریک کی تفصیلات کے ساتھ حلقہ اربابِ ذوق کے آغاز وارتقاء کا بھی احاطہ کیا ہے۔

جدید ادب: جدید ادب کے مطالعے میں بھارت میں نمو پانے والے جدید اردو ادب پر بہت کم بات کی گئی ہے، اس لیے پاکستانی ادب پر بہت زیادہ بات کرنے کے باوجود اس موضوع میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے، ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں اس مسئلے کو تعصب قرار دیا ہے، پاکستانی ادب کے حوالے سے اس کتاب میں خاصا مواد موجود ہے جس میں جدید دور کی ادبی تخلیقات اور تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی جدید اصناف، مثلاً، افسانہ، آزاد نظم، ہائیکو، نثری نظم، انشائیہ، کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

۳۔ اسلوب:

اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی طرز، طریقہ، انداز، اور ڈھنگ کے ہیں، انگریزی زبان میں اسلوب کے لیے "Style" کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور عربی میں اسے سبک کہتے ہیں، اردو میں اس کے لیے انداز، طرز اور اسلوب کے الفاظ مروج ہیں۔ ادبی تناظر میں اگر ہم اسلوب کی معنویت پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ہر شاعر اور نثر نگار کا اپنا جداگانہ طرزِ نگارش ہے جو اس کی تحریروں کو دیگر لکھنے والوں سے ممتاز کرتا ہے، اسلوب کی تعمیر میں مصنف کی فکری روش، سماجی و معاشرتی حالات، معاشی مسائل، مذہبی و تہذیبی رجحانات اور نفسیاتی عوامل کارفرما ہوتے ہیں، مصنف اپنی، تخلیقی، تنقیدی یا تحقیقی روش کو ان تمام عوامل کے زیر اثر اپنے کسی مخصوص نظریاتی رنگ میں ڈھال کر تحریر کی صورت دے دیتا ہے اور یہی مخصوص نظریاتی رنگ اس کے اسلوبِ نگارش کی بنیاد بن کر اس کی تحریروں کو خاص پہچان عطا کرتا ہے۔ ادب میں نمایاں مقام رکھنے والے شاعر اور ادیب اپنے طرزِ تحریر میں بھی انفرادیت کے حامل ہوتے ہیں یوں ان کا اسلوب بھی ایک طرح سے ان کی پہچان کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم کلاسیکی شعراء میں ولی دکنی، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، میر انیس، مرزا

اسداللہ خاں غالب اور جدید شعراء میں، میراجی، ن۔م راشد، علامہ محمد اقبال، فیض احمد فیض، ساغر صدیقی، عبد الحمید عدم، ناصر کاظمی، احمد فراز، محسن نقوی، جون ایلیا، اور راحت اندوری کے منفرد رنگ کو پیش کر سکتے ہیں کہ ان اصحاب کی شعریات کا مخصوص اسلوب بھی اب ان کی پہچان کا ذریعہ ہے۔

مصنف یا ادیب کے منفرد اندازِ تحریر کی تشکیل میں اس کا وہ مخصوص نظریاتی رنگ کارفرما ہوتا ہے جو مجموعی طور پر اس کی نفسیات پر غالب آتا ہے اور تمام رجحانات کو ایک مخصوص جہت پر ڈال کر اسلوب کو نمایاں کرتا ہے، پروفیسر نثار احمد صدیقی اپنے ایک مضمون میں اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> اسلوب کا لفظ دیکھئے۔ یہ طریقہ، راستہ، روش اور ڈھنگ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسالیب اس کی جمع ہے۔ فی الاصل کسی متعین و متقین روش کے لیے ہے۔۔۔ اسی لیے یہ ادب میں کسی مخصوص اندازِ نگارش کے واسطے بولا جاتا ہے۔ جس میں لکھنے والے کی شخصیت کے منفرد خد و خال نظر آئیں۔۔۔ اردو میں اس کے لیے ایک لفظ انداز بھی مستعمل ہے۔ میر تقی میر اردو کا پہلا شاعر شاعر ہے جس نے یہ لفظ ان مخصوص معنوں میں استعمال کیا تھا۔۔۔ اگر چہ میرؔ نے لفظ انداز ان مخصوص معنوں میں نہیں لکھا تھا جو اب اس سے مستفاد ہوتے ہیں بلکہ انہوں نے اسے ایہام اور ''ریختہ ہندی و فارسی آمیختہ'' کے مقابلے میں استعمال کیا ہے اور خود ہی وضاحت کر دی ہے کہ یہ تمام صنائع کو محیط ہے۔ میرؔ کے ذہن میں اس کی تعریف اسٹائل کے مروجہ مفہوم سے یقیناً مختلف رہی ہو گئی۔ لیکن انہوں نے ''انداز'' کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس لفظ کا اطلاق بڑے وسیع مفہوم پر کرتے ہیں۔۔۔ یوں تو ہر شخص کی ایک شخصیت بھی ہوتی ہے اور کسی نہ کسی درجے میں ندرت و انفرادیت رکھتا ہے اور اسلوب خواہ وہ تحریر کا ہو یا تقریر کا، ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے انسان اپنی شخصیت کا اثر دوسروں پر ڈالتا ہے۔ یعنی جب وہ لکھتا ہے تو اس کا ذہن اور مزاج الفاظ و عبارات میں منتقل ہو جاتے ہیں اور اس کی شخصیت اپنا عمل شروع کر دیتی ہے۔۔۔ بعض مخصوص الفاظ کسی مصنف کے ذہن کا آئینہ ہوتے ہیں یہ بھی دو طرح کے ہیں یا تو وہ عام استعمال کے

الفاظ ہوں گے مگر ایک مصنف کی تحریر میں اتنی بار آئیں گے کہ اس کی مخصوص افتادِ ذہنی یا رجحانِ طبعی اور زاویہ فکر کا نشان بن جائیں گے۔ یا بعض مصنفوں کے فن پاروں میں نئے اور غیر مانوس الفاظ ایسی خوبصورتی سے استعمال ہوں گے کہ نہ صرف ان کے اسٹائل کو دلپسند اور دلنشیں بنا دیں گے بلکہ ان کی انفرادیت کو بہت نمایاں کر دیں گے۔(۴)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں ڈاکٹر سلیم اختر کی ادبی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس کتاب میں مصنف کا اسلوب ادبی تاریخ نویسی کے روایتی اسالیب سے متصادم نظر آتا ہے۔ اردو کی ادبی تواریخ میں عموماً اسلوب کی سنجیدگی کا خیال رکھا جاتا ہے، زیادہ تر مورخین وقوعات وشخصیات کے احوال کا جائزہ تحقیقی انداز میں لینے پر زور دیتے ہیں، بعض مورخین ادبی تاریخ پر تنقید وتحقیق کا متوازن اطلاق کرتے ہیں، اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی روایت میں کسی مخصوص تنقیدی نقطہ نظر کے تحت ادبی تاریخ قلمبند کرنے کا رجحان نہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی ادبی تاریخ تنقید کے نفسیاتی نقطہ نظر یا دبستان کی تحت لکھی جانے والی ادبی تاریخ ہے، اس کتاب کی تحاریر ہلکے پھلکے انشائی انداز لیے ہے جس میں بسا اوقات پنجابی زبان کے الفاظ اور محاورات کا بھی استعمال کیا گیا ہے جس کا ایک مقصد یہ ہے کہ مطالعے کے دوران قاری اکتاہٹ کا شکار نہ ہو، اس ضمن میں کتاب میں مختلف موضوعات کے عنوانات کو دیکھا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ مصنف نے اس کتاب میں ضرب المثل، محاوروں، اور دلچسپ ادبی لطائف وواقعات سے اپنے اندازِ تحریر کو جاندار بنانے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کی تحریر کے چند ظریفانہ نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

ایہام گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

اردو غزل گو شعراء کے لیے اس نے ایسے نمک کی صورت اختیار کر لی جس کے بغیر غزل کی ہنڈیا بدمزہ سمجھی جاتی۔۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۱۷۳

ہم پنجابی ڈھگوں کے لیے اردو محض ایک لیس دار اور بے معنی سبزی ہے۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۱۸۷

پاکستانی ٹیلی وژن ڈراما کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ضیاء الحق اور اس کے بعد نواز شریف کی میڈیا پالیسی نے ڈراموں پر جو قدغنیں لگائیں ان کی وجہ سے ڈرامے کا تخلیقی پہلو مجروح ہوا اور ڈراما انسانی نفسیات کی عکاسی کرنے کے بجائے میڈیا پالیسی کے مطابق ''منجی پیڑھی ٹھکاؤ'' قسم کی چیز بن کر رہ گیا۔ ان حالات میں اگر کبھی اچھا ڈراما دیکھنے ملے تو تعجب ہوتا ہے کہ ''ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، ص ۳۹۸

مرزا ہادی رسوا کے بارے میں مسعود حسن رضوی ادیب کے مضمون کا ایک دلچسپ اقتباس نقل کیا ہے جس کا ابتدائی حصہ کچھ یوں ہے۔

جب مرزا صاحب نے اپنا ناول ''امراؤ جان ادا'' شائع کیا تو کسی مصلحت سے اپنا نام ظاہر نہیں کیا بلکہ اس کے سرورق پر مصنف کا نام ''مرزا رسوا'' لکھ دیا۔ اس ناول کی شہرت کے ساتھ وہ ''رسوا'' ہونے لگے۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، ص ۴۰۳

ہائیکو کے شاعروں کو مصنف ''تین سطری شاعری کے تین سطری شاعر'' کہتے ہیں اور آگے چل کر لکھتے ہیں۔

ابوالحسن رودکی نے مذکر قصیدہ کے جسد سے ٹیڑھی پسلی کی مانند تشبیب کو الگ کر کے مؤنث غزل کی صورت میں نئی صنفِ سخن متعارف کرائی۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، ص ۱۱۸

انشائیہ کے بارے میں کچھ یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

انشائیہ ایسی مردہ صنفِ سخن ہے کہ ہنوز طاقت کے انجکشنوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، ص ۱۲۷

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب کے مختلف موضوعات اور ابواب کے ناموں کو بھی مزاح کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے ان کی اس روش پر ڈاکٹر گین چند جین اور دیگر محققین ادب شاکی نظر آتے ہیں، موضوعات کے ناموں کے اس انداز سے قاری کو جو دقّت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ فہرست میں موجود بعض عنوانات کی وضاحت نہیں ہو پاتی کہ اس کی ذیل میں کس موضوع پر بات کی گئی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر چونکہ افسانہ نگار بھی ہیں اس لیے اس کتاب میں بعض مقامات پر ان کی تحریروں میں افسانوی رنگ کی جھلک بھی نظر آتی ہے کتاب کے باب نمبر ۱۲ ''داستان سرائے'' کا آغاز ''تحیّر کی تال پر دھڑکتا دل'' کے عنوان سے کچھ یوں کرتے ہیں۔

> تپتی مسافتوں کے بعد اہلِ قافلہ ڈھلتے سایوں کے ایک نخلستان تک پہنچ چکے تو مسافر اور جانور دونوں بے حال تھے مگر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جیسے جسم سے تھکن نچوڑتے جا رہے ہوں۔ کھانا کھانے تک ستاروں سے دمکتا رات کا سیاہ آنچل صحرائی آسمان کی وسعت کو نظروں سے چھپا چکا تھا۔ طمانیت، سکون اور راحت کی گرانباری معدہ کے خمار کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اعصاب کو سرشار کر رہی تھی۔ چاندنی میں ریگستان ریت کے لہراتے سمندر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ الاؤ روشن ہوا سیاہ قہوہ کا دور شروع ہو گیا۔ تب الاؤ کے گرد دائرہ تنگ ہونا شروع ہو گیا کہ قصہ خواں لب کشا ہوا۔ الاؤ کی مچلتی شاخیں قصہ خواں کے ساخوردہ چہرہ پر ان دیکھے نقوش بکھیر رہی ہیں۔ سامعین کی آنکھیں ہلتے لبوں پر مرکوز ہیں۔ نیم وا آنکھوں میں ان دیکھے سپنوں کی دم توڑتی چنگاریاں مچل رہی ہیں تو تصور ماضی کے پراسرار جہانوں کی سیاحت کر رہا ہے۔ کوہِ کاف، پلید دیو، سبز پری، پراسرار ساحر، طلسمی قلعہ، مرہم سلیمانی، اژن قالین، سبز پوش بزرگ، ناطق طوطا، گاتی مینا، سلیمانی سرمہ، زنبیل۔ (۵)

اس کتاب میں شاعرانہ اصطلاحات، تراکیب، اور الفاظ، چراغِ آفریدم، گردشِ لیل و نہار، جگر کاری، نالہءعشاق، فکرِ سخن، تنگنائے غزل جیسے الفاظ کا بکثرت استعمال کیا گیا ہے، جس سے مصنف کے اندازِ نگارش کو ایک خاص قسم کی شاعرانہ چاشنی عطا کرتے ہیں۔ شعرا کے ذکر کے ساتھ ان کے کلام کے نمونوں کے علاوہ دیگر

مسائل پر تحقیقی وتنقیدی بحث کے دوران بھی حسبِ موقع شعراء کے مشہور اشعار کی مدد سے تعبیر وتشریح کا کام لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی زیادہ تر نثر خواہ وہ افسانہ، ہو تنقید ہو یا تحقیق انسانی نفسیات کی اثر پذیری مختلف مدارج، مضمرات، محرکات اور جنس و جذبات کی تشریحات پر مشتمل ہے۔ نفسیات اور جنس ان کے محبوب موضوعات ہیں۔ اس لیے ان موضوعات سے متعلق الفاظ و اصطلاحات و تراکیب مثلاً تحلیلِ نفسی، تخیل، شعور، لاشعور، جنس، لذت، مزاج، اور تصور وغیرہ ان کی تحریروں میں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں، افسانوی اور انشائی اندازِ تحریر بھی ان کے اسلوب کے عناصر ترکیبی میں شامل ہیں، نفسیاتی عناصر کی جھلک ان کے اسلوب میں اس لیے نظر آتی ہے کہ انھیں انسان کی نفسیات سے فطری لگاؤ ہے اور ادب میں نفسیاتی تنقید سے ان کی وابستگی اسی لگاؤ کے باعث پیدا ہوئی، جنسی معاملات کا انسان کی نفسیات سے گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے یہ موضوع بھی ان کا پسندیدہ ہے، مصنف چونکہ اوائل عمری سے افسانہ نویسی کی طرف مائل رہے اس لیے ان کی تحریروں میں افسانوی رنگ کا ہونا بھی ایک فطری امر ہے، ہلکا پھلکا مزاحیہ اور انشائی انداز شاید ان کی آزادانہ طبیعت کا پرتو ہے، اس کے علاوہ اپنے مخالفین کے بارے میں سخت لہجہ بھی ان کے اسلوب میں اپنا رنگ جماتا نظر آتا ہے۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے اسلوب میں نفسیاتی تنقید کے مباحث کا رنگ غالب نظر آتا ہے مصنف نے جا بجا اشخاص اور ادب پاروں کی تشریح و تاویل کے لیے نفسیات اور نفسیاتی تنقید کا سہارا لیا ہے۔

مصنف غالبؔ کے کلام اور ان کی شخصیت پر اپنی آراء کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

> غالب اپنے عصر کا آئینہ ہی نہ تھا بلکہ اپنے طرزِ احساس کی بنا پر وہ ہمارا ہم عصر بھی بن جاتا ہے۔ اسی لیے غالب ہر عہد میں زندہ ہی نہ رہا بلکہ جدید بھی رہا۔ جب نفسیات کی روشنی میں غالب اور اس کے کلام کو پڑھیں تو اس کے ہاں نرگسیت (الفتِ ذات) کا رجحان قوی تر نظر آتا ہے جس نے ایک طرف تعلّی کا روایتی روپ دھارا تو دوسری طرف عشق کی اساس انا پر استوار کی۔ یہی نہیں اس کے ہاں محبوب کے بارے میں جس مریضانہ رشک کا اظہار کیا گیا اس کی جڑیں بھی نرگسیت میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ وہ شعوری طور پر اپنے عشق کی برتری کا احساس کراتا ہے، اسی لیے قدیم عُشاق سے موازنہ میں نہ صرف

اپنی برتری ثابت کی بلکہ عشق و عاشقی سے متعلق بیشتر مُسلّمات اور روایات سے انحراف بھی کیا۔ اس کے ہاں جنس کے بارے میں بھی بہت صحت مند رویہ ملتا ہے۔ وہ حسن پرست اور نظر باز تو تھا ہی سو جوانی میں اس کے بقول ''ایک ستم پیشہ ڈومنی'' سے عشق ہوا جو مرگِ محبوب کی وجہ سے داغِ محرومی کا باعث بنا۔ گویا غالب عشق کے کوچہ سے نابلد نہ تھا اور چاہنے اور چاہے جانے کی لذت سے آشنا تھا۔ (۶)

انسانی نفسیات اور جنس سے متعلق چند اور نمونے اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ سے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

نظیر کو آج کی نفسیاتی اصطلاح میں خارج بین (EXTRAVERT) کہا جا سکتا ہے۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، ص ۱۷۹

کچھ آگے چل کر کہتے ہیں:

نظیر کی افسردگی خارجی حالات کے برعکس ایسی نفسی کیفیت معلوم ہوتی ہے جسے کیموفلاج کرنے کے لیے اس نے گلی کوچوں کی دنیا اور اس کے میلے ٹھیلوں کی بھیڑ میں خود کو گم کرنا چاہا ہو مگر جو مسلسل تخلیقی محرک کے طور پر برقرار بھی رہی۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، ص ۱۷۹۔۱۸۰

یاس یگانہ چنگیزی کی نفسیات کا نقشہ کچھ یوں کھینچتے ہیں۔

جہاں تک یگانہ کی عظیم نرگسیت اور اس پر مبنی انا کا تعلق ہے تو میر کی مانند وہ بھی نفسیاتی مطالعہ کے لیے ٹیکسٹ بک کیس ہسٹری نظر آتا ہے۔ شعراء میں بالعموم اپنی شاعری کے بارے میں انا ہوتی ہے جس کا اظہار تعلّی سے بھی ہوتا ہے، لیکن یگانہ کی نہ جھکنے والی نرگسیت نے اس میں وہ ضد پیدا کر دی کہ ٹوٹ تو گیا مگر جھک نہ سکا۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن،ص ۴۰۹

ترقی پسند تحریک میں حقیقت نگاری کی شدت اور انسان کی داخلی کیفیات و احساسات کو نظر انداز کر دینے کی روش پر ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی ادبی تاریخ میں یوں روشنی ڈالی ہے۔

> حقیقت نگاری نے خارجیت پر اتنا زور دیا کہ انسان کے باطن کو قطعی طور سے بھلا دیا گیا اور ماحول کی عکاسی کرتے وقت یہ بھول گئے کہ انسانی سائیکی کا بھی ایک لینڈ سکیپ ہوتا ہے جو کہ خارجی ماحول سے کسی طور سے بھی کم دلچسپ اور غیر اہم نہیں۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن،ص ۵۳۰

اس کتاب کی عبارات میں ادبی تاریخ نویسی کی مروجہ سنجیدگی نہیں ملتی، مصنف اپنی آزادانہ طبیعت کی رو میں بہتے نظر آتے ہیں۔محاوروں، تیکھے جملوں، پر لطف واقعات، اشعار اور ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز سے اس کتاب میں ایک نیا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ضرورت کے تحت انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔یہ کتاب تنقید کے نفسیاتی دبستان کے نظریات، میلانات اور اصول وضوابط کی عکاسی کرتی ہے، اسی لیے اس کتاب میں جا بجا انسانی نفسیات کے محرکات اور تخلیقات پر اس کے اثرات کے مباحث ملتے ہیں۔

۴۔ تنقیدی زاویہ:

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، کے بارے میں عام طور پر محققین ادب کی رائے ہے کہ یہ ایک تنقیدی تاریخ ہے۔اس کتاب میں ادبی تاریخ اور وقوعات کے ساتھ ساتھ ادبی تنقید کا دائرۂ کار بھی وسیع ہے، مصنف نے اپنے مخصوص تنقیدی نقطہ نظر کے تحت اس کتاب میں مختلف موضوعات پر بحث کی ہے، ڈاکٹر سلیم اختر کے چند ایسے تنقیدی مضامین جو مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے اس کتاب میں شامل ہیں، نفسیاتی کے حوالے سے مصنف نے تخلیق اور تخلیق کار پر تفصیلی مباحث قلمبند کیے ہیں لیکن کسی مسئلے پر اپنی آرا پیش کرتے وقت ڈاکٹر سلیم اختر نے صرف نفسیاتی تنقید کو ہی پیمانہ نہیں بنایا بلکہ اس مسئلے کا ہر زاویے سے تنقیدی مطالعہ کیا اور اس پر اپنے تاثرات قلمبند کیے، نقاد کی ذمہ داریوں اور ادبی تنقید کے معیارات کی روشنی میں اگر مصنف کی تنقیدی

روش کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بعض مقامات پر انہوں نے ذاتی تعصّبات کو تنقید کے اصولوں اور معیارات پر فوقیت دی ہے اور اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے، ادبی تنقید تعصّبات اور نزاعات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> رائے کی تشکیل میں پسند وناپسند، ترجیحات، تعصّبات وغیرہ مخصوص کردار ادا کرتے ہیں اور یہ سب ادبی مؤرخ کی انفرادی نفسیات سے ماورا نہیں۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں مصحفی، بہادر شاہ ظفر اور غالب سے جو سلوک روا رکھا اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں مومن کا ذکر ہی گول کر دیا۔ یہ سب ان کی ترجیحات کا غماز ہے۔ ایسی ترجیحات سب کی ہوتی ہیں۔ تنقیدی اساس مستحکم ہو یہی تنقیدی رائے بن جاتی ہے ورنہ بصورتِ دیگر تعصب کا نام پائے گی۔۔۔ تعصب میں البتہ جو والہانہ پسندیدگی اور انتہائی ناپسندیدگی ملتی ہے اس کا تعلق کسی تنقیدی تصور یا کالم کی فنی خوبیوں یا خامیوں سے نہیں ہوتا بلکہ یہ سراسر ذاتی تعلقات اور شخصی روابط کی بنا پر ہوتا ہے۔ اس لیے ترجیح کے مقابلے میں تعصب منفی قرار پاتا ہے کیونکہ آنکھوں پر ذاتیات کی پٹی بندھ جانے کے بعد بصارت کے ساتھ ساتھ تنقیدی بصیرت بھی غائب ہو جاتی ہے۔ ترجیح کے برعکس تعصب معاصرین سے ہوتا ہے کہ یوں ہدف سامنے ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تعصب میں اضافہ نفرت اور خشونت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہر عہد کے ناقدین اور ادبی مورخین میں ترجیحات اور تعصّبات ملتے ہیں۔ یہ مثبت رویہ نہیں لیکن کیا کیا جائے کہ یہی حقیقت ہے۔(۷)

زبان: ڈاکٹر سلیم اختر چونکہ ایک ماہر لسانیات بھی ہیں اس لیے اپنی ادبی تاریخ میں اردو زبان کے آغاز اس کے نام کے مباحث، زبان کو درپیش لسانی خطرات، اور پاکستان میں اردو اور دیگر علاقائی زبانوں کی حالتِ زار کا خلاصہ ماہرینِ لسانیات کی قدیم وجدید تحقیقات کی روشنی میں پیش کیا ہے، ہندی یا ہندوی کو اردو کا قدیم نام قرار دیتے ہوئے مصنف نے قدیم لغات، صوفیاء کرام کے اقوال، مثنویات، دیگر نثری تصانیف اور محققین کی تحقیقات کے حوالے پیش کیے ہیں۔ پاکستان میں اردو زبان کی حیثیت اور اس کے مستقبل کے بارے میں ڈاکٹر

سلیم اختر مایوس نظر آتے ہیں اور وہ خود کو اپنی زبان کی بقا کی جنگ کا ایک ہارا ہوا سپاہی تسلیم کرتے ہیں، زبانوں کی بقاء کی بحث میں انھوں نے انگریزی زبان کی عالمی اجارہ داری اور اردو زبان کو درپیش چیلینجز کے ساتھ ساتھ پاکستان کی علاقائی زبانوں کی معدومیت کے خطرات کی طرف بھی توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔

کلاسیکی ادب: اس کتاب میں مصنف نے کلاسیکی ادب کی بحث کو آٹھ ابواب میں سمیٹا ہے، اردو ادب کے آغاز کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر دکن کی اولیت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، انھوں نے کلاسیکی ادب کی تشکیل کرنے والے تاریخی، سیاسی، سماجی اور مذہبی عوامل کا احاطہ کرتے ہوئے زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں شاہی سرپرستی، مذہبی رسومات، صوفیا کی تعلیمات، اور دیگر سماجی عناصر پر تفصیلی بات کی ہے۔ کلاسیکی شعراء اور ادباء پر بات کرتے ہوئے مصنف نے ان کے حالاتِ زندگی، تخلیقات اور تخلیقی محرکات کا جائزہ نفسیاتی تنقید کی روشنی میں پیش کیا ہے مثال کے طور پر مصنف نے میر کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی زندگی کے مسائل، امرد پرستی، انا اور درویشی، کے ان کے فن پر اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے اور جنس کو الم کی طرح میر کی شاعری کا ایک اہم محرک قرار دیا ہے۔

بعض مقامات پر مصنف کے بیانات میں الجھاو بھی نظر آتا ہے مثال کے طور پر اردو تنقید کے آغاز کے حوالے سے پہلے وہ یہ رائے دیتے ہیں کہ اردو تذکرے تنقید کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں، پھر میر کو اردو کا پہلا نقاد قرار دیتے ہیں، لیکن اس بیان کے ساتھ بھی ایک شرط لگا دیتے ہیں۔

سرسید تحریک اور ادبی نشاۃ ثانیہ: سرسید تحریک کی فعالیت اور اس کی مخالفت کا جائزہ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال کے تناظر میں لیتے ہوئے مصنف نے اسے ہندوستانی معاشرے کے گدلے پانی پر پڑنے والے ایک ایسے پتھر کی مانند قرار دیا ہے جس سے اس کے اطراف میں ارتعاش اور حرکت پیدا ہوئی، اور اردو ادب پر ادبی نشاۃ ثانیہ کی صورت میں اس کے اہم اثرات پڑے، اسی تحریک کے زیر اثر اردو ادب میں کئی نئی اصناف وجود میں آئیں اور ادب میں مقصدیت کو اساسی اہمیت حاصل ہوئی، مصنف نے سرسید تحریک کے ضمن میں اس کے ردعمل کے طور پر سامنے آنے والے عناصر کا مذہبی اور نفسیاتی عوامل کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

سرسید کے خیالات نے ملک بھر میں آگ لگا دی چنانچہ اس تحریک کے خلاف ردِعمل بھی کوئی کم نہ ہوا۔انفرادی احتجاج اور کٹ ملاّؤں کی تکفیر سے قطع نظر ''اودھ پنچ'' کی صورت میں اچھا خاصا متحدہ محاذ قائم تھا بلکہ سرسید کے ساتھ ساتھ حالی بھی نہ بخشے گئے کیونکہ ان کے لیے علیحدہ کالم مخصوص تھا جس کی تنقید کا اندازہ سرنامہ کے اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے(۸)

مصنف نے سرسید کے رفقاء، حالی، آزاد، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کے حالات وفن کا بھی احاطہ کیا ہے، ڈپٹی نذیر احمد کو کنجوس اور سود خور قرار دیا ہے، ان کے فن پر بات کرتے ہوئے ان کی ناول نگاری میں مقصدیت اور اصلاح کے عناصر کو جابرانہ اور ان کی کہانیوں کو بے اثر قرار دیا ہے۔ان کے خیال میں نذیر احمد کے ناولوں میں انسانیت کے گہرے مطالعے سے جنم لینے والی ژرف نگاری کا فقدان ہے۔مولانا محمد حسین آزاد کے ذہنی بگاڑ کے مسئلے پر ان کی زندگی کے نامساعد حالات، باپ کی انگریزوں کے ہاتھوں موت، جاسوسی کے شعبے سے تعلق، اور جوان بیٹی کی موت کی روشنی میں نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔

ترقی پسند تحریک: ڈاکٹر سلیم اختر ترقی پسند تحریک سے وابستہ مصنفین کو نظریاتی طور پر اشتراکیت کے حامی سمجھتے ہیں، انہوں نے ترقی پسند تحریک کے مصنفین کے سیاسی عمل دخل، تحریک کے بنیادی مقاصد سے انحراف، انتہا پسندی، معاشرتی ردِعمل اور تحریک میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ اور اس کے انحطاط پر تنقیدی بحث کی ہے مصنف کے خیال میں اس تحریک کے انحطاط جنسی حقیقت نگاری اور بعض مصنفین کی شدت پسندی نے اہم کردار ادا کیا۔حلقہ اربابِ ذوق کے حوالے سے مصنف کا خیال ہے کہ اس کا قیام ترقی پسند تحریک کی مخالفت یا ردِعمل کے طور پر عمل میں نہیں آیا لیکن جو شاعر اور ادیب ترقی پسند تحریک کے بانیان کی شدت پسندی کے مخالف تھے ان کے لیے حلقہ اربابِ ذوق ایک اہم مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔

پاکستانی ادب: ترقی پسند تحریک کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو کے جدید ادب کے ضمن میں کلی طور پر پاکستان میں نمو پانے والے ادب پر ہی بات کی ہے، اس حوالے سے تقسیم کے نتیجے میں سامنے آنے والے

انسانیت سوز واقعات اور ہجرت کے مصائب کے زیر اثر پنپنے والے ادب پر تخلیق کاروں کی نفسیات کی روشنی میں تحقیقی و تنقیدی بحث کی ہے، پاکستانی شعراء اور نثر نگاروں پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے ان کے حالات وفن کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے، ان کے خیال میں اردو ادب کے محققین اور ناقدین نے تحقیق وتنقید کے میدانوں میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں، لیکن نثری تخلیقات کے حوالے سے وہ مطمئن نہیں ان کا کہنا ہے کہ اردو ناول کی ۱۴۰ سالہ زندگی میں اچھے ناولوں کی تعداد ایک درجن بھی نہیں بنتی، جس کی وجوہات زندگی کے بارے میں ناکافی تجربہ اور تخلیقی صلاحیتوں کی کمی قرار دیتے ہیں۔

پاکستانی معاشرے کے منفی رویوں مذہبی شدت پسندی، آمریت، کرپشن، اور ناقص تعلیمی نظام پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کی ذمہ داریوں کی کچھ یوں وضاحت کرتے ہیں۔

> پاکستان مذہب کے نام پر بنا اور مذہب کے نام پر برباد ہو رہا ہے۔ ملک بنیاد پرستی کی مٹھی میں ہے جس کی وجہ سے غیر عقلی روّیے تقویت حاصل کر رہے ہیں۔ طویل آمریت نے جمہوری نظام کو مفلوج کر دیا ہے۔۔۔۔ یہ وہ ملک ہے جس میں اخلاقیات نام کی کوئی سے نہیں پائی جاتی۔ ان حالات میں ترقی پسند دانشوروں کے سامنے نئے اہداف ہونے چاہئیں جن کی کمی بھی نہیں اس ضمن میں ترقی پسند نقاد پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ادب کی پرکھ کے لیے اسے ماضی کے انتقادی فارمولوں سے انحراف کرتے ہوئے ادبی تخلیقات کا بہ اندازِ نو تحلیل و تجزیہ کرنا ہوگا اورس مقصد کے لیے، مقصد، افادہ، زندگی کی بھی تشریح درکار ہوگی۔ ترقی پسندی انسانی زندگی اور اس کے حوالہ سے معاشرہ کے اقدار کی چھان پھٹک ہے، ترقی پسندی ارتقاء کے مترادف ہے۔ اس لیے ترقی پسندی کے عمل کو ایک تحریک، ایک منشور اور خطبات و مقالات تک محدود نہیں کرنا چاہئے۔ (۹)

۵۔ فکری زاویہ:

ڈاکٹر سلیم اختر نے ادبی اور علمی مسائل پر بحث کرتے ہوئے ان پر اپنا حتمی فیصلہ صادر کرنے کی بجائے مختلف کتب اور اخبارات ورسائل میں ان مسائل سے متعلق شائع ہونے والی تحقیقی تحاریر کے حوالوں سے بحث کی ہے اور حتمی فیصلے کی ذمہ داری قاری کو سونپ دی ہے، یوں قاری جدید ادبی تحقیقات سے آگاہی حاصل کرنے

کے ساتھ ساتھ ادبی نزاعات پر غور وخوص کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے، مصنف کی فکری روش میں ان کے وسیع مطالعے کے اثرات نمایاں ہیں اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، کی اساس بھی اسی اندازِ فکر پر استوار کی گئی ہے، اس کتاب میں مختلف ادبی وعلمی مسائل پر اس طرح سے بحث کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ قدیم و جدید تحقیقات قاری کے سامنے پیش کی جاسکیں، چند ایک ذاتی نزاعات کے علاوہ اردو زبان کے آغاز وارتقاء، زبانوں کی معدومیت، غالبیات، اقبالیات، اردو ادب کے آغاز، جدید اردو ادب، جدید رجحانات ومیلانات اور دیگر مسائل پر مصنف نے اپنی عمر بھر کی ریاضت کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ اردو زبان وادب کی تحقیقات کے ساتھ ساتھ مصنف نے اس کے متعلقات پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے، زبانوں کی معدومیت کے حوالے سے پاکستان کی علاقائی اور دنیا کی دیگر زبانوں کے وجود کو درپیش خطرات کے بارے میں یو۔ این۔ او، یونیسکو، اور اخبارات و رسائل کی عالمی تحقیقات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے پاکستان کی علاقائی زبانوں کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

> جہاں تک پاکستان میں اردو کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کیے جانے کا تعلق ہے تو میں خود کو اس ہاری ہوئی جنگ کا شکست خوردہ سپاہی تسلیم کرتے ہوئے اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اردو کو اس کا حق دلانے کی کوشش میں ہم نے یہ حقیقت فراموش کر دی کہ پاکستان کی دوسری زبانیں بھی ہماری توجہ کی محتاج ہیں۔ پنجابی، سرائیکی، پشتو، بلوچی، ہندکو، سندھی وغیرہ تو ہمارے سامنے کی ہیں لیکن پاکستان میں گنتی کی یہ چند زبانیں ہی تو نہیں بولی جاتیں۔ صرف شمالی علاقہ جات ہی میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں ۔ بلتی، شینا، بروشسکی، کوہستانی، کھوار، واخی، ڈوکی، کاشغری، اور ان کے ساتھ ساتھ فارسی، کشمیری، گوجری، اور ہندکو بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اسی طرح بلوچستان میں براہوئی زبان بھی ہے جبکہ خود پنجابی اور سرائیکی کے کئی لہجے ہیں۔ ہنزہ، چترال، دیر اور کافرستان کی متعدد زبانیں بھی توجہ کی منتظر ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ پاکستان کے ان دور افتادہ علاقوں میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں وہ کس حال میں ہیں اور ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ (۱۰)

اردو زبان کے آغاز کے بارے میں اردو زبان وادب کے مورخین ماہرین لسانیات اور محققین کے

نظریات کی تائید یا تردید میں اپنی ادبی تواریخ میں کافی کچھ لکھ چکے ہیں اردو زبان کے آغاز کے بارے میں ابتدائی نظریات، میر امن، سرسید احمد خان اور مولانہ محمد حسین آزاد نے پیش کیے۔ آزاد نے ''آبِ حیات'' میں یہ نظریہ پیش کیا کہ اردو زبان کا ماخذ برج بھاشا ہے، بعد ازاں اردو کی پہلی باقاعدہ ادبی تاریخ ''تاریخ ادبِ اردو'' میں رام بابو سکسینہ نے آزاد کے اسی نظریے کی تائید کی، ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی ادبی تاریخ میں اردو زبان کی تشکیل کو ایک طویل لسانی عمل کا ثمرہ قرار دیتے ہوئے اسے سندھی، ملتانی، سرحد کی زبانوں، پنجابی اور کھڑی بولی کا ملغوبہ ظاہر کیا ہے، ڈاکٹر انور سدید نے اپنی ادبی تاریخ ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' میں پنجاب اور سندھ کو اردو زبان کا اصل وطن قرار دیا ہے۔ اردو زبان کے آغاز کی بحث چونکہ کافی گھمبیر ہے اس لیے کسی ایک نظریے کی صداقت کو ثابت کرنا کافی مشکل امر ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے مختلف محققین کے نظریات میں سے کسی ایک کی تائید کرنے یا کوئی نظریہ قائم کرنے کے بجائے اب تک اردو زبان کے آغاز کے بارے میں پیش کیے جانے والے تمام نظریات کو اردو لسانیات کا سرمایہ اور اس کی رنگینی قرار دیا ہے، اس حوالے سے اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں لکھتے ہیں۔

> مختصر ترین الفاظ میں یہ وہ نظریات ہیں جن سے ہم اردو کے آغاز اور اس کی تشکیل میں ممد محرکات اور صورت پذیری کے باعث بننے والے تمام عناصر سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ان نظریات میں سے کلیتاً نہ تو کسی کی تردید کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کسی ایک پر دوسرے کو خصوصیت سے ترجیح دی جا سکتی ہے۔ سب میں کسی نہ کسی حد تک صداقت موجود ہے۔ یہ جزوی سہی مگر اس سے چشم پوشی بھی تو نہیں کی جا سکتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو لسانیات نے محدود عرصہ میں جو گراں قدر تحقیقات سرانجام دیں اور ان نتائج میں نظریات کا جو تنوع ملتا ہے وہی تو ہماری لسانیات کا اصل سرمایہ ہے۔ یہ نظریات اپنے تضادات، انتہا پسندی یا خامیوں کے باوجود بھی مختلف رنگوں اور وضع کے ان شیشوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو انفرادی حیثیت میں تو چاہے کچھ بھی نہ ہوں لیکن مل کر جب ایک Mosaic کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو پھر اردو زبان یا ''اردو کی زبان'' کی ایک تصویر بن جاتی ہے۔ یہ تصویر مکمل نہ سہی اور اس میں قطعیت کا فقدان بھی تسلیم! لیکن اس کے ''رنگین'' ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہی ''رنگینی'' اردو لسانیات کی بھی خصوصیت قرار پاتی

ہے(۱۱)

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں اصلاحِ زبان کے ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ناسخ کی تحریک اور متروکات کے سلسلے کو ایک منفی عمل قرار دیا ہے ان کے بموجب ناسخ نے اردو زبان سے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ نکال تو دیئے لیکن ان کی جگہ متبادل الفاظ زبان میں شامل نہیں کیے، اصلاحِ زبان کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے اہمیت کی حامل ہے کسی بھی زبان کا تغیراتی عمل دراصل فطری ہوتا ہے، زبان ایسے الفاظ جن کی اسے ضرورت ہوتی ہے وقتاً فوقتاً دوسری زبانوں سے حاصل کرتی ہے یہ ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کا متبادل اس زبان میں پہلے سے موجود نہیں ہوتا لسانی تغیر کا سلسلہ طویل دورانیے پر مشتمل ہوتا ہے جس میں زبانیں غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے سے لسانی لین دین کرتی ہیں، اس کے برعکس اردو لسانیات میں اصلاحِ زبان کے نام پر ایک ایسی تحریک چلائی گئی جس میں مذہبی اختلاف کو بنیاد بنا کر ارادی طور پر زبان کی تراش خراش کی گئی اس سلسلے میں علماء اور شعراء نے برابر کا حصہ ڈالا، ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی زبان کی قطع و برید کا یہ سلسلہ شروع ہو چکا تھا بعد میں اسی سلسلے کی کوکھ سے اردو ہندی تنازعے نے جنم لیا اور ایک ہی زبان کے دو رسم الخط وجود میں آئے، اور یوں ہندوستان کے تمام لوگوں کی ایک مشترکہ زبان دو رنگوں میں رنگ دی گئی ایک رنگ مسجد والوں کے ساتھ مخصوص ہو گیا اور دوسرا مندر والوں کے ساتھ۔

زبان کی کانٹ چھانٹ کے عمل کو پاکستان میں زبان کی ترویج و ترقی کے بعض قومی اداروں نے آگے بڑھانے کی کوشش کی اور جدید سائنسی و علمی ایجادات و اصطلاحات پر کافی کام کیا، عربی چونکہ ہماری مذہبی زبان ہے اس لیے اصطلاحات سازی پر کام کرنے والے علماء نے عربی اور تھوڑا بہت فارسی کا سہارا لیا اور بھاری بھرکم اصطلاحات ایجاد کرتے رہے جو ان اداروں کی طرف سے شائع کی جانے والی کتب کا حصہ تو بنتی رہیں لیکن زبان کا حصہ نہیں بن سکیں نئی نسل ان بھاری بھرکم اصطلاحات اور اسماء کے بجائے انگریزی زبان کے الفاظ کو ہی ترجیح دیتے ہیں اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ عربی اصطلاحات کافی مشکل ہوتی ہیں اور یہ ہماری زبان اور جدید عالمی زبان انگریزی کے مزاجوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں اور ایسی اصطلاحات اور اسماء کے تلفظ کی ادائیگی میں قاری کو کافی مشکل پیش آتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ انگریزی زبان تمام تر جدید علوم پر حاوی ہونے کی وجہ سے عالمی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور ہر شخص کسی بھی دوسری زبان پر محنت کرنے کے

بجائے انگریزی زبان کو ہی ترجیح دیتا ہے، ہمارے لسانی ماہرین ایک زبان سے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اردو کے دامن میں دوسری زبان کے الفاظ کی یورش کر دیتے ہیں اس سارے عمل میں مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا اثر نمایاں نظر آتا ہے ورنہ تو لسانی ماہرین کو عربی کے بجائے اردو میں موجود الفاظ اور انگریزی کے الفاظ کی آمیزش سے اصطلاحات سازی کے عمل کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی ادبی تاریخ میں جہاں ادب کے جدید نظریات اور میلانات و رجحانات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے وہاں قدیم ادب اور اس کے متعلقات کی اہمیت و افادیت اور جدید و قدیم ادب کے باہمی ربط کو بھی اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے داستانوی ادب سے متعلق باب ''داستان سرائے'' میں انسان کی محیر العقول واقعات و عناصر میں دلچسپی اور جدید فکشن اور قدیم داستانوی ادب کے تعلق پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

> جدید انسان کی شخصیت کا یہ عجب تضاد ہے کہ ایک طرف وہ سائنس کے ذریعے سے قدیم ، مذہبی اور اخلاقی مسلمات کی حقانیت کو چیلنج کر رہا ہے تو دوسری طرف سائنس فکشن کی صورت میں نئی اساطیر کی تشکیل کر کے اپنے لیے سامان دلبستگی بھی تلاش کر رہا ہے چنانچہ سائنس فکشن کو قدیم داستانوں کا جدید اور محیر العقول واقعات کا سائنسی روپ قرار دیا جا سکتا ہے۔ قدیم داستانوں کے دیو اور جادوگر کی جگہ اب اس سائنس دان نے لے لی ہے جو اپنے کمپیوٹر میں جلتی بجھتی روشنیوں کے کنٹرول پینل کے سامنے بیٹھا ایک بٹن دبا کر سب کچھ کر گزرنے پر قادر ہے۔ ساحر کے چھومنتر کی جگہ اب ریموٹ کنٹرول نے حاصل کر لی ہے۔ مافوق الفطرت مخلوقات، طلسمی پرندوں، عجیب الخلقت جانوروں اور پراسرار کرداروں کی جگہ اب روشنی کے لاکھوں برسوں کے فاصلہ پر واقع اجنبی سیاروں کی عجیب وغریب مخلوقات نظر آتی ہیں ۔۔۔ الغرض! جدید سائنس فکشن بنیاد بھی تخیل کی اسی لامحدود کارکردگی پر استوار نظر آتی ہے جو کبھی اساطیر اور داستان میں تحیر خیز واقعات ، مافوق الفطرت مخلوقات اور خارق عادات وقوعوں کی اساس اور جواز مہیا کرتی تھی، اس لیے اگر قدیم داستانوں کی کے رسیا سامعین یا قارئین کی مانند آج سائنس فکشن کے ایڈیکٹ ملتے ہیں تو بآسانی تعجب نہ ہونا چاہئے کہ تخیل، قوی اور جبلت کے لحاظ سے انسان بجنسہ انسان

ہی رہے گا، فرق صرف مقام اور انداز و اسلوب سے پیدا ہوتا ہے، اب قہوہ خانہ کی جگہ سنیما اور ٹیلی ویژن نے لے لی اور داستان گو کا کام کیمرہ مین نے سنبھال لیا ہے۔ گویا تمام ذہنی اور سائنسی ترقی کے باوجود احساساتی لحاظ سے آج کا انسان صدیوں پہلے کے انسان کا کا کزن ہی نظر آتا ہے۔(۱۲)

ڈاکٹر سلیم اختر کے نقطہ نظر اور فکری زاویے کی جانچ پڑتال کے حوالے سے ان کی آپ بیتی ''نشانِ جگرِ سوختہ'' کا مطالعہ بھی اہمیت کا حامل ہے اس آپ بیتی میں مصنف نے اپنی نجی زندگی کی تفصیلات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات اور رجحانات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی آپ بیتی ۲۰۰۵ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئی، ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب کے آغاز میں ''سرِ بازارمی رقصم'' کے عنوان کے تحت آپ بیتی کی تاریخ، فن، آپ بیتی کے فنی مسائل، اور آپ بیتی لکھنے کے اصول وضوابط پر روشنی ڈالی ہے اور بقیہ حصے میں اپنی زندگی کا احوال درج کیا ہے کتاب کا نام ''نشانِ جگرِ سوختہ'' غالب کے اس شعر سے لیا گیا ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

یہ آپ بیتی پہلے پہل ڈاکٹر عطا الحق قاسمی کے رسالے ''معاصر'' میں قسط وار چھپی، ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی اس آپ بیتی میں اپنی ہی ذات کی تحلیل نفسی کا تجربہ کیا ہے، انھوں نے اپنے تنقیدی اور نفسیاتی رجحانات اور تحقیقی تجربے کے تحت خود کو نفسیات کے ترازو میں تولنے کی کوشش کی ہے، اپنی زندگی کے شب و روز کی تفصیلات میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے نفسیاتی اور جنسی مسائل، نفسیات پر اثر انداز ہونے والے حادثات و واقعات اور انسانی زندگی کے مختلف ادوار میں نفسیات کی تغیر پذیری پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی ہے۔

کتاب کے ابتدائیے میں اپنی اس کاوش کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

تعلّی میرے مزاج کا حصہ نہیں مگر ''نشانِ جگرِ سوختہ'' کے بارے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح میں نے اپنی تحلیل نفسی کی اور کسی لکھنے والے نے خود کو نفسیات کے محدب شیشہ تلے نہ رکھا ہوگا۔ اپنی تحلیل نفسی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے

سو اس کی داد چاہوں گا کہ کھلی آنکھوں سے بلا کسی جبر و استکراہ، تحلیل نفسی کے چھتہ میں ہاتھ ڈال دیا اور کسی وجہ سے نہ سہی تو کم از کم اسی باعث یہ آپ بیتی یاد رکھی جا سکتی ہے۔ میرے نفسیاتی خوف، نائٹ میئرز، اعصابیت اور اعصابی تناؤ۔ ان سب کی روداد کیس ہسٹری کے انداز پر تحریر کر دی ہے۔

بیا جاناں تماشا بیں کہ در انبوہِ رسوائی
بصد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم (۱۳)

جنس اور نفسیات ہمیشہ سے ہی ڈاکٹر سلیم اختر کے محبوب موضوعات رہے ہیں مصنف کی اولین طبع زاد کتاب عورت جنس اور جذبات جو کہ جنسی موضوعات پر مشتمل ہے ۱۹۶۲ء میں میں شائع ہوئی، اسی زمانے میں مصنف نے ''ہیولاک ایلس'' کی مشہور کتاب "Psychology of sex" کا بھی اردو میں ترجمہ کیا لیکن بدقسمتی سے کسی وجہ سے یہ کتاب شائع نہ ہو سکی اور اس کا مسودہ کہیں گم ہو گیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر اوائل عمری سے ہی استادی یا پروفیسری کے متمنی تھے اور بن کر رہے۔ بحیثیت استاد ان کی صفات اور کردار مثالی رہا، انھوں نے اپنے شاگردوں کو ہمیشہ اپنی اولاد کا درجہ دیا کبھی کسی خاتون شاگرد کے ساتھ غیر مہذب رویہ یا رشتہ قائم نہ کیا، کلاس میں اپنے طلبہ کو ہمیشہ دوستانہ ماحول مہیا کیا۔ حد درجہ نرگسی مزاج ہونے کے باوجود انھوں نے ہمیشہ استاد اور شاگرد کے رشتے کے تقدس کو قائم رکھا۔

پاکستان کی سیاسی صورتِ حال اور سیاسی جماعتوں کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر کا موقف دوٹوک رہا ہے ان کے خیال میں ابتداء ہی سے پاکستان کے سیاست دانوں نے کرپشن، اقربا پروری، عدم انصاف، اور لوٹ مار کی بنیادوں پر سیاست کو پامال کیے رکھا جس کا خمیازہ آج تک ساری قوم بھگت رہی ہے، تفرقہ، مذہبی تعصب، اور جہالت کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

۱۹۴۷ء میں ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے، جبکہ ۱۹۷۱ء میں بنگالیوں نے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان مسلمان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہنوز چاروں صوبے بھی مسلسل یہی ثابت کر رہے ہیں کہ مسلمان مسلمان کے ساتھ نہیں رہ سکتا، تو پھر مسلمان کس کے ساتھ رہ سکتا ہے غالباً حوروں کے ساتھ یا پھر یورپین

ممالک اور بالخصوص امریکہ میں ۔۔۔گنبدِ خضرا کے عشاق کا خواب تو گرین کارڈ ہے۔(۱۴)

ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے کسی انجانے خوف، نائٹ میئرز، ذہنی تناؤ اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہے، بغیر کسی خاص وجہ کے کیونکہ ان کے مالی حالات اتنے زیادہ پریشان کن نہ تھے اور نہ ہی محبت کو انہوں نے اتنا زیادہ سر پر سوار کیا سو اس کی ایک ہی وجہ نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ مصنف حد درجہ حساس تھے کہ ذرا سی بات کو پریشان کن مسئلے میں تبدیل پاتے، بہر حال اس ساری صورتِ حال کے نتیجے میں کچھ اور نہ سہی ایک بڑا نفسیاتی نقاد اردو ادب کے حصے میں ضرور آیا۔

مصنف کا نقطہ نظر قدامت پسندانہ نہیں لیکن وہ ادب کے قدیم سرمائے کی اہمیت و افادیت کے قائل ہی نہیں بلکہ شخصیات، تخلیقات اور ادبی اصناف کے آغاز و ارتقاء کی تحقیق کے حوالے سے کلاسیکی ادب کی چھان پھٹک پر توجہ دینے کی ضرورت پر زور بھی دیتے ہیں، جس کی کئی مثالیں ان کی کتاب میں موجود ہیں، جیسے میر کو اردو کا پہلا نقاد قرار دیتے ہیں، جعفر زٹلی'' کو اردو میں مزاہمتی ادب تخلیق کرنے والا پہلا شاعر قرار دیا ہے، انشائیہ کے ابتدائی نقوش ملا وجہی کی ''سب س'' میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے مصنفین کی شدت پسندی کے برعکس وہ اس تحریک سے وابستہ اشتراکی نظریات کی حمایت کرتے ہیں اور ترقی پسندی کو کسی خاص گروہ یا منشور یا عہد سے وابستہ کرنے کے بجائے اسے ایک ہمہ گیر نظریے کے طور پر سمجھنے اور اس کو ادب اور معاشرے پر لاگو کرنے کے حامی ہیں۔

ج: تاریخ نویسی کے اصول اور مصنف کے نجی رجحانات:

تاریخ نویسی کے اصولوں کی روشنی میں اگر اردو کی ادبی تواریخ کو پرکھا جائے تو بیشتر تواریخ میں تاریخیت کے تسلسل، غیر جانبدارانہ رویہ، جدید رجحانات کے مطالعہ، اور تاریخ نویسی کے سائنسی طریقہ کار کا فقدان نظر آتا ہے، بعض ادبی تواریخ جن کے مورخین نے تاریخ نویسی کے ان چیدہ چیدہ نکات کی طرف توجہ دی ہے ان میں، ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردو، ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اردو ادب کی تاریخ، ڈاکٹر وہاب اشرفی کی تاریخِ ادبِ اردو، اور ڈاکٹر سلیم اختر کی اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اہمیت کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ میں ایک اہم مسئلہ ان کا مخالفین کے لیے متعصّبانہ اور جارحانہ رویہ ہے جو ان کی ادبی تاریخ

کی اہمیت وافادیت میں کمی کا باعث بنتا ہے، اس کے علاوہ ان کے اسلوبِ بیان پر بھی اردو ادب کے محققین نے کافی اعتراضات اٹھائے، ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ لکھی تو گویا ادبی تاریخ نویسی کی روایت ان کی زندگی کا لازمہ بن کر رہ گئی انھوں نے ساری زندگی اپنی ادبی تاریخ کی ترتیب وتزئین میں صرف کر ڈالی اور یوں تمام عمر ادبی تاریخ نویسی کے عمل میں گرفتار رہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے اسلوبِ بیان پر جہاں اعتراضات اٹھائے گئے وہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ انھوں نے ادبی تاریخ نویسی کے نپے تلے اور مقفع و مسجع طرزِ تحریر سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے مخصوص انشائی اور ہلکے پھلکے اندازِ تحریر سے ادبی تاریخ نویسی کی روایت کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کروایا، مصنف نے اپنے نجی رجحانات کے تحت ادبی تاریخ نویسی میں نفسیات، شعور و لاشعور، جنسیات، اور تحلیلِ نفسی جیسے مباحث پر خصوصی توجہ دی یوں کہ مصنف ایک طرف ادب اور ادیبوں کے متعلق تاریخی واقعات قلمبند کرتے ہیں تو دوسری طرف ان واقعات اور شخصیات کے پیش و پس منظر میں چھپے نفسیاتی عوامل کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور اپنے مخصوص تنقیدی نقطہ نظر سے تخلیق اور تخلیق کار پر اثر انداز ہونے والے سماجی، نفسیاتی اور جغرافیائی عوامل پر بھی پر مغز مباحث قلمبند کرتے ہیں۔

سہ ماہی فنون کے لیے لکھے گئے ایک مضمون میں ڈاکٹر سلیم اختر تاریخ ادب، تخلیق اور تخلیق کار کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> تاریخِ ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے کسی زبان کی جغرافیائی حدود سے مخصوص لسانی، روحانی، تہذیبی، تمدنی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی عوامل ومحرکات کے عمل اور ردِ عمل سے تشکیل پانے والے ذہنی تناظر میں وقوع پذیر ہونے والی تخلیقات کی معیار بندی لسانی مضمرات اور تخلیقی شخصیات کا کا مطالعہ تاریخ نگاری اور ان ہی کا مطالعہ، تجزیہ و تحلیل اور تشریح ادبی مورخ کا فریضہ!۔۔۔۔ ادب کے سماجی یا عمرانی مطالعہ میں یہ اساسی الجھن جنم لیتی ہے کہ عصری عوامل ومحرکات اور ان سے جنم لینے والے ذہنی تناظر میں یکسانیت کے باوجود اور ایک ہی عہد کے سیاسی، سماجی، روحانی، اور اقتصادی حالات میں اشتراک کے باوجود تمام ادیب یکساں ذہنی سطح، مشترک سوچ اور باہم مشابہہ

تخلیقات کے حامل نہیں ہوتے جزوی طور پر تو ایسا ہی ہوتا ہے اور بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ ایک خاص عہد کی تخلیقات کے تنوع کی اساس اسی ''یکسانیت''، ''تکرار''، ''اشتراک'' اور مشابہت پر استوار ہوتی ہے جو کسی عہد کو دیگر زمانوں سے ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔۔۔۔ یکساں حالات میں ہم عصر ہونے کے باوجود مختلف تخلیق کاروں میں جو ذاتی اپج، انفرادیت اور منفرد فکری رویے ملتے ہیں یہ ان کی نفسی ساخت کی بنا پر ہے۔(۱۵)

مصنف کے خیال میں ہر عہد کے اپنے مخصوص سیاسی، اقتصادی، اور سماجی حالات ہوتے ہیں اور انہی عوامل کے زیر اثر نمو پانے والی تخلیقات کے مجموعی تاثر سے اس زمانے کی ایک الگ پہچان بنتی ہے، لیکن اس اشتراک کے باوجود ہم عصر ادیبوں کی ذاتی انفرادیت اور مخصوص نقطہ نظر نفسیاتی ساخت کی مختلف جہتوں پر دلالت کرتی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب تحقیق کا فن میں مختلف مغربی اور مشرقی مورخین کے حوالوں سے ادبی تاریخ کی ہیئت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کے مطابق ادبی تاریخ کو نہ تو محض سوانحی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہونا چاہیے اور نہ ہی فقط سماجی تاریخ ہو، ادبی تاریخ میں ادب کا مسلسل ارتقاء کا نظر آنا لازم ہے، باقی ادبی عوامل ثانوی حیثیت سے تاریخ کا حصہ بنیں، گیان چند جین نے تاریخ نویسوں کے حوالے سے خصوصی طور پر یہ تاکید کی ہے کہ ادبی تاریخ کو ادبی تنقید بنانا کسی بھی طور جائز نہیں، ادبی تاریخ پہلے ادبی تاریخ ہو اور بعد میں کچھ اور یعنی ادبی تاریخ میں موجود دیگر عوامل کا تاثر تاریخیت پر غالب نہ آئے۔

مورخ اور تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چند جین نے بعض ایسے عوامل کی نشاندہی کی ہے جن کا اثر لازمی طور پر ادبی تخلیق پر پڑتا ہے وہ عوامل یہ ہیں۔

۱۔ افکار و تصورات

۲۔ مذہبی عقائد

۳۔ سوشلزم

۴۔ وجودیت

۵۔ مارکسیت

۶۔ فرائیڈ کی جنسی نفسیات

اسی طرح سیاسی اور سماجی اداروں کی ذیل میں

۱۔ سیاسی پارٹیاں

۲۔ کلب

۳۔ سکول، کالج، یونیورسٹیاں

۴۔ سیمینار

۵۔ مباحثے

۶۔ سمپوزیم

۷۔ روایات اور اساطیر وغیرہ

گیان چند جین کے خیال میں تاریخ نویس کو ادبی تاریخ قلمبند کرتے وقت ان عوامل پر خصوصی توجہ دینی چاہئے کیونکہ یہی عوامل تخلیق کار کی تخلیقی صلاحیتوں پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔

اسی طرح انھوں نے مورخ اور محقق کے لیے کرداری اور اخلاقی اوصاف، حق گوئی، بے تعصبی اور غیر جانبداری، معتدل اور لچکدار رویہ، بے غرض تحقیق، رغبت اور ولولہ، سنجیدگی اور اعتدال، منکسر المزاجی، اخلاقی جرات، غیر مقلد مزاجی، کشادہ نظری، استحفامی مزاج، سائنسی قطعیت، مواد کی تنظیم میں مہارت، کرید کی اہلیت، دیگر زبانوں سے واقفیت کو لازمی قرار دیا ہے۔

اردو کی ادبی تاریخ نویسی میں اصول وضوابط کے حوالے سے محققین اور ناقدین کے مضامین پر مشتمل چند ایک کتب کے علاوہ کوئی با قاعدہ اور منضبط کتاب موجود نہیں اس موضوع پر گزشتہ ابواب میں تفصیلی بحث شامل کی گئی ہے۔ محققین ادب کے مضامین میں سے چند ایک نکات کشید کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ تحقیق اور تنقید کا توازن: اردو کی ادبی تواریخ میں تحقیق و تنقید کے توازن کا فقدان ہے، ڈاکٹر جمیل جالبی، تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر وہاب اشرفی کی تواریخ کے علاوہ دیگر تواریخ یا تو خالص تحقیقی انداز میں قلمبند کی گئیں یا پھر تنقیدی مباحث کو کثرت سے کتاب میں شامل کیا گیا، ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ میں بھی تنقیدی مباحث کی بھر مار ہے جس کی وجہ سے مختصر ترین ہونے کے باوجود یہ کتاب خاصی طوالت پکڑ چکی ہے،

۲۔ حرکت، ارتقاء، اور تسلسل: عمومی تاریخ کی طرح ادبی تاریخ نویسی میں بھی حرکت اور ادب کے ارتقاء میں تسلسل کا ہونا لازم ہے، تاریخ کو زنجیر کی ان کڑیوں کی صورت میں پیش کیا جانا چاہئے جو ایک دوسرے سے مل کر ایک مربوط نظام تشکیل دیتی ہیں، تاریخی وقوعات کو مختلف زمانوں یا علاقوں کی حدود میں قید کر دینے سے، تاریخ کی حرکت اور اس کے تسلسل کی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں اس لیے تمام حالات و واقعات کے باہمی تعلق کی وضاحت ادبی تاریخ نویسی کا ایک اہم عنصر ہے۔

۳۔ روایت کا تصور: ہر زبان کے ادب میں روایت کا تصور موجود ہوتا ہے جو ادب کے آغاز و ارتقاء اور تغیر و تبدل کی داستان کا احوال اپنے اندر سموئے ہوتا ہے، اس لیے مورخ کا ادب کی عہد بہ عہد ترقی کے احوال پر مبنی ادبی تاریخ کی روایت کے تصور سے آگاہ ہونا لازم ہے۔

۴۔ سوانحی مواد کی چھان بین اور جمع و ترتیب: سوانحی مواد کی چھان پھٹک اور اس کی ترتیب کا عمل ادبی تاریخ نویس کے لیے ایک مشکل کام ہوتا ہے، مورخ کو درست مواد کی جمع آوری کے لیے حتی الامکان تاریخ ادب کے بنیادی ماخذات سے رجوع کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد اس کی ترتیب میں اسے مختلف ادوار کے باہمی ربط کو مدِ نظر رکھ کر تاریخی خاکہ مرتب کرنا پڑتا ہے۔

۵۔ اجتماعی تحاریک اور رجحانات کا احاطہ: تاریخ ادب کی تدوین میں شخصیات اور تخلیقات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ مورخ کو مختلف ادبی تحاریک اور نظریات و رجحانات کا بھی احاطہ کرنا پڑتا ہے، اس کے علاوہ ایسے معاشرتی واقعات و حادثات اور انقلابات بھی ادبی تاریخ کا حصہ ہونگے جن کے ادب پر اثرات پڑے۔

۶۔ اہم اور غیر اہم کا تعین: ادب کے ذیل میں صدہا نام آتے ہیں اور ان سب کو ادبی تاریخ کا حصہ نہیں بنایا جا سکتا اس لیے ادبی مورخ پر اہم اور غیر اہم ناموں کے تعین کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے، اس سلسلے میں ادبی مورخ کو غیر جانبدار ہو کر صرف ان اشخاص و، وقوعات اور تخلیقات کو ادبی تاریخ میں شامل کرنا پڑتا ہے جو ادب

کے منظر نامے میں نمایاں اہمیت کے حامل ہوں۔

۷۔ رسوم و روایات اور معاشرتی روّیوں کے ادب پر اثرات کا مطالعہ: ہر زبان کے ادب پر اس کے معاشرے کی تہذیب وثقافت، رسم و رواج اور مختلف معاشرتی رویّوں کا اثر پڑتا ہے، بلکہ ابتدائی طور پر نمو پانے والا ادب معاشرتی روایات کا ہی مرہونِ منت ہوتا ہے، اسی طرح معاشرے کے اجتماعی رویّوں کا بھی ادب پر اثر پڑتا ہے، اس ضمن میں ہندوستان کے بادشاہی دور میں پنپنے والے ادب اور تقسیم ہند کے بعد کی مایوس کن صورتِ حال میں نمو پانے والے ادب کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ادبی مورخ کو ان تمام امور کی روشنی میں تاریخی تغیرات کا جائزہ پیش کرنا چاہئے۔

۸۔ ادب سے متعلق دیگر علوم کا مطالعہ: ادب بنیادی طور پر سماجی علوم کی ہی ایک شاخ ہے، مورخ کو عمرانیات، سماجیات، عمومی تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، مذہبی علوم، جدید علمی و ادبی نظریات اور دیگر زبانوں کے ادب سے بھی واقفیت ہونی چاہئے تاکہ ادب کی تشریح وتاویل کا کام بخوبی سرانجام دیا جاسکے۔

۹۔ ادوار بندی کے معاملے کا درست ادراک: ادوار بندی کا معاملہ خالصاً مورخ کی صواب دید پر منحصر ہوتا ہے کیوں کہ ادب میں ادوار بندی کا کوئی باضابطہ اصول وضع نہیں لیکن مورخ کو اس سلسلے میں ادبی تاریخ کے ارتقاء اور تاریخیت کے تسلسل کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے، تاکہ مختلف زمانوں اور علاقوں میں ظہور پذیر ہونے والے ادب کا باہمی ربط نمایاں ہوسکے۔

۱۰۔ سنین کی صحت پر مستند تحقیق: بعض شخصیات اور وقوعات کے سنین کے حوالے سے ادبی مورخین اور محققین میں اختلافات پائے جاتے ہیں ایسے میں درست سن کا انتخاب کرنا کافی مشکل ہوتا ہے، ادبی مورخین سنین کی صحت کی تحقیق کے لیے براہ راست اصل ماخذات اور حقائق پر مبنی تاریخی شواہد تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۱۔ تمام اصنافِ ادب کا احاطہ: ادبی مورخ کو ادب میں مروجہ نظم ونثر کی تمام اصناف کو ادبی تاریخ میں اس طرح جگہ دینی چاہئے کہ اس کے آغاز وارتقاء، ہئیت اور اس سے وابستہ اہم شخصیات کا احاطہ ہوسکے۔

۱۲۔ لسانیات کی جانکاری: لسانیات کا مطالعہ ایک الگ علم کے طور پر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ادب کے

ایک جزو کی حیثیت سے بھی زیر بحث لایا جاتا ہے، اس لیے ادبی مورخ کے لیے لازم ہے کہ وہ لسانیات کا علم بھی رکھتا ہو تا کہ زبان سے متعلق مباحث کا بخوبی احاطہ کیا جا سکے۔

۱۳۔ جدید ادبی و علمی نظریات سے آگاہی: دیگر علوم کی طرح ادب بھی تغیر و تبدل کے عمل میں گرفتار ہے نت نئے تجربات، واقعات، رجحانات اور نظریات ادب کا حصہ بنتے رہتے ہیں، مورخ اگر جدید نظریات و مباحث سے ناواقف ہوگا تو تاریخ نویسی کا حق ادا نہیں کر سکے گا۔

۱۴۔ تخلیق کاروں کی نگارشات کے نمونوں کا حصول: فکری میلانات و رجحانات اور اسلوب کی وضاحت کے لیے شعراء اور ادیبوں کی نگارشات کے نمونوں کو بھی ادبی تاریخ میں شامل کرنا پڑتا ہے، قاری انہی نمونوں کی مدد سے لکھاری کی ذہنی اپج کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

۱۵۔ پر تاثیر اور سادہ اسلوب: تحریر خواہ تخلیقی ہو یا تحقیقی اس کے اسلوب کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، تحریر کا اسلوب جس قدر جاندار، پر تاثیر اور سادہ ہوگا قاری اتنی ہی دلجمی اور شوق سے اس کا مطالعہ کرے گا ، اردو کی ابتدائی ادبی تواریخ میں اندازِ بیاں مقفع و مسجع اور سنجیدہ نظر آتا ہے لیکن جدید دور کے مورخین نے ادبی تاریخ نویسی کو سادہ اسلوب میں قلمبند کرنے پر زور دیا، ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ میں ان کا اسلوب سادہ اور ہلکا پھلکا مزاحیہ انداز لیے ہے۔

۱۶۔ غیر جانب دارانہ روّیہ: ادبی مورخ کو ذاتی پسند و ناپسند اور علاقائی و مذہبی تعصّبات، سے بالاتر ہو کر ادبی تاریخ نویسی کا کام سرانجام دینا چاہئے، اردو کی ادبی تواریخ میں بعض مورخین ذاتی تعلقات کی بنا پر ایسے شعراء اور ادیبوں کو بھی تاریخ میں جگہ دینے کی کوشش کرتے ہیں جن کی تاریخ کو قطعی ضرورت نہیں ہوتی یا پھر ایسے اہم لکھاریوں کو جن کی ادبی خدمات نا قابلِ فراموش ہوتی ہیں ذاتی تعصّبات کی وجہ سے نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کا ذکر بہت ہی سرسری یا کبھی کبھی منفی انداز میں کرتے ہیں، مورخینِ ادب کا ایسا طرزِ عمل ادبی تاریخ نویسی کے وقار کو بری طرح مجروح کرتا ہے۔

۱۷۔ تلاشِ حق: سچائی کو تلاش کرنے کی سعی کرنا اور سچائی کو بیان کرنا انسان کے اعلیٰ اقدار کی نشانی ہے، ادبی مورخ پر بھی یہ لازم ہے کہ وہ تمام ممکنہ وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ادبی وقوعات کے بارے میں حقائق کی چھان پھٹک کرے، گو کہ یہ ایک مشکل کام ہے لیکن ادبی تاریخ اسی وقت ادبی تاریخ کہلانے کی مستحق ہوگی جب

مورخ تاریخی واقعات کی تہہ تک پہنچ کر قاری کے سامنے حقائق پر مبنی مواد پیش کرے، اس سلسلے میں نقل در نقل کی روایت سے اجتناب کے ساتھ ساتھ صبر و تحمل سے مسلسل جدوجہد کرنے کی ضرورت ہوگی۔

ان نکات کی روشنی میں اگر ڈاکٹر سلیم اختر کی اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس کتاب میں سب سے پہلا مسئلہ جو سامنے آتا ہے وہ تنقیدی مضامین کی بے جا طوالت ہے، اس کتاب کے ابتدائی ایڈیشنوں میں صورت حال قدرے بہتر تھی لیکن سال بہ سال کی تحریف و اضافت کے دوران مصنف نے کتاب میں تنقیدی مباحث میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا جس کی وجہ سے یہ تاریخ اب ایک تنقیدی تاریخ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔اس کے علاوہ مصنف کی ذاتی ادبی چپقلش اور معاصرانہ چشمک کا مسئلہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے بقول وہ اس دشمنی کو خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہیں لیکن یہ مسئلہ ان کی ادبی تاریخ نویسی کے باب میں متنازعہ ثابت ہوا اور معاصرین پر ان کے جارہانہ بیانات کی وجہ سے محققین ادب نے ان کی ادبی تاریخ پر اعتراضات اٹھائے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے خیال میں ادبی مورخ کو تاریخ کسی مخصوص تنقیدی نقطہ نظر کے تحت لکھنی چاہئے انھوں نے خود اپنی ادبی تاریخ کے لیے نفسیاتی تنقید کو محدب شیشہ بنایا، وہ ان وقوعات کو جو نفسیاتی نوعیت کے ہوں اور جن سے تخلیقی لاشعور منفی یا مثبت لحاظ سے متاثر ہوا ہو، نمایاں کرنا لازم سمجھتے ہیں، کتاب کا اسلوب اردو ادب کی عام تواریخ کی طرح سنجیدہ نہیں لیکن ہم اسے مشکل اور گنجلک اسلوب نہیں کہہ سکتے گو کہ ان کے ہلکے پھلکے مزاحیہ اندازِ تحریر پر محققین نے اعتراض کیا ہے لیکن ان کا یہ اسلوب قاری کو اکتاہٹ سے بچائے رکھتا ہے۔

د۔ فکشن کی تاریخ و تنقید:

اردو کے افسانوی ادب میں ڈرامہ، گیت اور داستان کو ہندوستان کی قدیم ادبی روایت سے جوڑا جا سکتا ہے، ڈرامہ اور گیت کے بعد داستان ہی ایسی صنفِ سخن ہے جس نے ہندوستان میں قبولیتِ عام حاصل کی، فارسی کی داستانوں کو اردو میں منتقل کرنے کے رواج کے متعلق جدید تحقیقات میں سب رس سے بھی پہلے کی داستانوں کے نسخے دریافت کر لیے گئے ہیں، اردو میں افسانوی ادب کا آغاز داستانوں کی صورت میں گو کہ بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کی سرپرستی میں داستانوی ادب کو عروج ملا ہندوستان کے نامور اہلِ قلم فورٹ ولیم کالج میں جمع ہو کر ڈاکٹر گلکرسٹ کی ہدایات کے مطابق فارسی

اور سنسکرت داستانوں کو عام ہندی زبان میں منتقل کرتے رہے، اس سلسلے میں باغ و بہار کو داستانوی ادب کا نقطہ عروج قرار دیا جاسکتا ہے، میر امن نے ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما پر قصہ چہار درویش کو ٹھیٹھ ہندی میں باغ و بہار کے نام سے منتقل کیا تو اس داستان کے چرچے آن کی آن میں پورے ہندوستان میں پھیل گئے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا بارہواں باب ''داستان سرائے کے نام سے قائم کیا ہے جس میں داستان کی قدیم روایت، مافوقیت، جدید داستانوی رنگ، کردار، فکشن پر مبنی فلموں، اور اردو کے داستانوی ادب کے سرمائے کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے، اس باب کے مختلف ذیلی عنوانات کے تحت مصنف نے اردو داستان گوئی اور داستان نویسی کی قدیم روایت کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے، داستان گوئی کے سلسلے میں میر انیس کے چھوٹے چچا میر امان مخلوق، اور میر باقر داستان گو کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔ ''داستان، تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان کے تحت مصنف نے داستان کی ہئیت، اقسام، اور ترقی پسند ادیبوں کے کلاسیکی ادب پر اٹھائے گئے اعتراضات کے جواب میں کلیم الدین احمد کا دفاعی بیان پیش کیا ہے۔

اسی باب میں میں مصنف نے داستان امیر حمزہ، فسانہ عجائب، بیتال پچیسی، بوستان خیال اور باغ و بہار کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے، اردو کی اولین داستان کے سلسلے میں مسعود حسین خان کی تحقیقات کے حوالے سے عیسوی خان بہادر کی داستان ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ باب نمبر ۱۳ میں بھی مصنف نے فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی داستانوں اور خصوصی طور پر ''باغ و بہار'' کا ذکر کیا ہے اور باغ و بہار کے قدیم ماخذات کی بھی نشاندہی کی ہے۔

باب نمبر ۱۴، سرسید تحریک اور ادبی نشاۃ ثانیہ میں مصنف نے سرسید اور ان کے رفقاء کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ناول نگاری کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں قدیم و جدید تحقیقات کی تفصیلات فراہم کی ہیں، اس ضمن میں ڈاکٹر شمیم حنفی کے بموجب ''منشی گمانی لعل'' کے ریاض دلربا ۱۸۳۲ء اور مولوی کریم الدین کے ناول خطِ تقدیر ۱۸۶۲ء کو ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مرۃ العروس ۱۸۶۹ء سے قبل کے ناولوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مشرف احمد کی تحقیقات کے مطابق ''شاہ حسین حقیقت'' کے ناول نشتر کے بارے میں بھی مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا باب نمبر ۱۷ ''اردو ڈراما'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے اس باب میں مصنف نے لفظ ڈراما کی تعریف، ڈراما کی روایت اور ہندوستان

میں ڈراما کے آغاز و ارتقاء اور مشہور ہندوستانی ڈراما نگاروں کا ذکر کیا ہے، اس باب کے آخر میں جدید ڈراما نگاروں، ریڈیائی اور ٹیلی ویژن ڈراموں کی تفصیلات دی ہیں۔

''عبوری دور کا ادب'' کے نام سے قائم کیے گئے باب نمبر ۱۸ میں مصنف نے ''ناول تاریخ سے حقیقت نگاری تک، اور ''پہلی ناول نگار خاتون'' کے عنوانات کے تحت، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا، اور رشیدۃ النساء بیگم کی ناول نگاری پر تحقیقی مواد فراہم کیا ہے۔ باب نمبر ۲۰ ''ترقی پسند ادب کی تحریک'' میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے اولین افسانوں اور ان سے پیدا ہونے والی ہنگامہ خیزیوں کا ذکر کیا ہے ،مصنف نے منشی پریم چند کو ترقی پسند تحریک کا نقط آغاز قرار دیا ہے۔ اس کتاب کا باب نمبر ۲۵ ''پاکستان میں اردو نثر کا تخلیقی منظر نامہ'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے جس میں تقسیم سے قبل کے فکشن پر مختصر سی بات کرنے کے بعد مصنف نے پاکستان کے بہترین ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کی لازوال تخلیقات پر بحث کی ہے۔

اس باب میں مذکور اردو کے اہم ناولوں میں بستی از انتظار حسین، راجہ گدھ از بانو قدسیہ، دشتِ سوس اور تلاش بہاراں، جمیلہ ہاشمی، آگ کا دریا از قرۃ العین حیدر، خدا کی بستی اور جانگلوس، شوکت صدیقی، علی پور کا ایلی از ممتاز مفتی، اداس نسلیں اور نادار لوگ از عبداللہ حسین، ایسی بلندی ایسی پستی از عزیز احمد، آنگن از خدیجہ مستور، شامِ اودھ از ڈاکٹر احسن فاروقی، بہاؤ اور راکھ از مستنصر حسین تارڑ، اور دیگر اہم ناول شامل ہیں۔ افسانہ نویسی کے حوالے سے ، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، ممتاز شیریں، اے حمید، آغا بابر، مستنصر حسین تارڑ، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے افسانوں پر بات کی ہے، اس باب میں مصنف نے سعادت حسن منٹو کی حیات اور ان کے فن پر نفسیاتی تنقید کی روشنی میں بحث کی ہے۔

ہ۔ شاعری کی تاریخ و تنقید:

ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا پہلا باب ''طاؤس، تختِ طاؤس اور تخلیق'' کے نام سے قائم کیا ہے اس کتاب کے اولین ایڈشنوں میں یہ باب شامل نہیں تھا، بعد ازاں پہلا باب قرار پانے والے اس باب میں مصنف نے شعر، شعر کی ہیئت، شعر پر موسم اور جغرافیہ کے اثرات، غزل میں تشبیہ اور استعارہ، درباری شاعری اور ادب پر اس کے اثرات پر تنقیدی بحث کی ہے۔ اس باب میں اردو زبان کے

آغاز وارتقاء کی بحث کے سلسلے میں امیر خسرو کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ ''تخلیقی زاویے اور اصنافِ ادب'' کے نام سے قائم کردہ چھٹے باب میں اصنافِ ادب کی تفصیلات دی گئی ہیں، مختلف اصنافِ ادب کے علاوہ اس باب میں مصنف نے شعری اسلوب، مشاعرے کی روایت، زنانہ مشاعرہ، اصنافِ شعر کی مقبولیت کے اتار چڑھاؤ اور مشاعرے کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنف مشاعرے کی روایت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> مشاعرہ ایک طرف ذوقِ سخن کی آبیاری کا باعث تھا تو دوسری جانب نو آموز شعراء کے لیے تربیت گاہ بھی تھا۔ سخن فہم حضرات اچھی غزلیں بیاضوں میں لکھ لیتے تھے آج یہ بیاض تحقیقات میں کارآمد ثابت ہو رہی ہیں۔ شاعرانہ چشمک ہمیشہ رہی ہے ماضی میں اس کے اظہار کی بہترین جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ چنانچہ مخالف کی زبان و بیان کی غلطیاں تلاش کی جاتی، بحر اور تقطیع کی بحثیں ہوتیں، اپنے شاگردوں سے اعتراضات کرائے جاتے اور جواب میں قول اور سندیں پیش کی جاتیں (۱۶)

اس کتاب کا باب نمبر سات ''جنوبی ہند میں اردو ادب'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے اس باب میں دکنی شعر و ادب کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں، مصنف دکنی شعر و ادب کا منبع، قطب شاہی اور عادل شاہی حکمرانوں کو قرار دیتے ہیں، ان کے خیال میں ان فرمانرواؤں کی ادب پروری اور ذاتی دلچسپی کی وجہ سے دکن میں اردو زبان و ادب کو کمال حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے اس باب میں اولیاء کرام کی مذہبی اور لسانی خدمات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ قلی قطب شاہ، ولی دکنی، ماہ لقا چندا بائی، اور سراج اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ اس باب کے اہم موضوعات ہیں، اس کے علاوہ اس باب میں ملا وجہی کی سب رس کے قدیم ماخذات اور جنوبی ہند میں مثنوی کے آغاز وارتقاء کی تفصیلات بھی درج کی گئی ہیں۔

''شمالی ہند میں اردو ادب'' اس کتاب کا آٹھواں باب ہے، اس باب میں دلی کی شعری فضا میں ہلچل مچانے والے ابتدائی شعراء جعفر زٹلی، شاکر، فائز دہلوی، مظہر جانِ جاناں، خان آرزو، حاتم، آبرو، میر تقی میر، سودا، خواجہ میر درد، نظیر اکبر آبادی، اور قائم چاند پوری کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ ایہام گوئی کی تحریک اور دلی کی شعری فضا پر اس کے اثرات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

باب نمبر نو بھی شعری تاریخ پر مبنی ہے اور یہ ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے، ڈاکٹر سلیم اختر نے اس باب کے آغاز میں واجد علی شاہ کی معزولی اور لکھنوی تہذیب کے زوال سے اثر انداز ہونے والی شعری فضا کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس کے بعد واجد علی شاہ، رنگین، مصحفی، انشاء اللہ خاں انشاء، جرأت اور آتش و ناسخ کے بارے میں تفصیلات بہم پہنچائی ہیں، ساتھ ہی ساتھ لکھنؤ کی کی اہم مثنویوں، گلزارِ نسیم، زہر عشق، بہارِ عشق، فریبِ عشق اور مرثیہ کی روایت پر مبنی تحقیقی و تنقیدی مباحث شامل کیے ہیں۔

''دلی کے نامور شعراء'' کے نام سے قائم کردہ باب نمبر ۱۰ میں دلی میں بہادر شاہ ظفر کے عہد کے اہم شعراء ذوق، غالب، مومن، شیفتہ، اور داغ دہلوی کے حالات اور فن کا جائزہ لیا گیا ہے، غالبیات کے حوالے سے ہونے والی قدیم و جدید تحقیقات کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں، ۔باب نمبر ۱۱ میں اردو نثر کے حوالے سے مستشرقین کی خدمات کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ یورپین شعراء کے حالات زندگی اور ان کا نمونہ کلام بھی دیا گیا ہے۔''عبوری دور کا ادب'' کے نام سے قائم کردہ باب نمبر ۱۸ میں مصنف نے یاس یگانہ چنگیزی کے حالات زندگی اور جدید شعری اصناف، سانیٹ، اور نظم معرا کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔علامہ اقبال کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے فن کا احاطہ کرنے کے لیے مصنف نے ایک الگ باب ''محرم رازِ درونِ میخانہ'' کے نام سے قائم کیا ہے، اس باب میں اقبال کے حالات، زندگی، علم و فن، شجرہ نسب، سیاسی کردار، آمدنی، فکر و فلسفہ، اور اقبالیات کے حوالے سے ہونے والی قدیم و جدید تحقیقات کی تفصیلات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت اور فن کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔

''پاکستان میں شعر کی صورتِ حال'' کے نام سے قائم کردہ باب نمبر ۲۵ میں ڈاکٹر سلیم اختر نے قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کی سرزمین پر شعر کی صورتِ حال بحث کی ہے، پاکستان میں اردو کے اہم شعرا، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، محسن نقوی، ظہیر کاشمیری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، قتیل شفائی، امجد اسلام امجد، افتخار عارف اور دیگر نامور شعرا کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ مع نمونہ کلام پیش کیا ہے، مزاحیہ شاعری کے اہم ناموں میں، انور مسعود، ضمیر جعفری، سرفراز شاہد، اور چند اور شاعر شامل ہیں۔اسی باب میں مصنف نے جدید مرثیہ اور دوہے کے اہم شعرا کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کا باب نمبر ۲۶ ''جوہر عورت کی نمود'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے، یہ باب شاعرات کے احوال پر مبنی ہے جس میں

کلاسیکی عہد کی شاعرات اور پاکستانی شاعرات کے حالات مع نمونہ کلام پیش کیا گیا ہے۔

شعری تاریخ وتنقید پر مبنی باب نمبر ۲۷ ''نئے رجحانات، تصوراتِ نو، نزاعی مباحث'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے جس میں نئے شعری رجحانات اور ہیئت کے نئے تجربات پر تحقیقی وتنقیدی مواد فراہم کیا گیا ہے، مصنف نے شعری کلیات کے حوالے سے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سب سے پہلے فیض احمد فیض کی کلیات ''سارے سخن ہمارے'' کے نام سے لندن سے شائع ہوئی، اس کے علاوہ علامتی شاعری کے آغاز وارتقاء کی تفصیلات اور شعراء کا نمونہ کلام بھی دیا گیا ہے۔ علامتی شاعری، نئی نظم، نثری نظم اور پاکستان کے جدید شعراء میراجی، منیر نیازی، جیلانی کامران اعجاز فاروقی، عارف عبدالمتین، عرش صدیقی، محسن نقوی، صبا اکبرآبادی، تابش دہلوی، شان الحق حقی، رسا چغتائی، حمایت علی شاعر، سلیم کوثر، جون ایلیا، محسن بھوپالی، قابل اجمیری، ریاض احمد، علامہ طالب جوہری، ظفر اقبال، افتخار جالب، اور دیگر شعراء کے مختصر حالات اور کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔ مصنف نے ہر شاعر کی شخصیت اور کلام پر مختصر تنقیدی خط کھینچا ہے اسی باب میں نثری نظم پر تفصیلی بحث کے ساتھ کچھ نثری نظموں کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پیش لفظ، تاریخ ادبِ اردو، طبع دوم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ص، اح

۲۔ وہاب اشرفی، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، جلد نمبرا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۸۔

۳۔ ضیاالحسن، ڈاکٹر، ادبی تاریخ نویسی میں تاریخی شعور کی اہمیت، مشمولہ، بازیافت، شمارہ، ن، جولائی ۲۰۰۷ء تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۹۔

۴۔ نثار احمد صدیقی، پروفیسر، اسلوب کیا ہے، مشمولہ، اردو محفل فورم، www.urduweb.org مورخہ دسمبر ۲۰۱۲ء۔

۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، سنگ، میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۷۱

۶۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۲۔

۸۔ ایضاً، ص ۳۲۵

۹۔ ایضاً، ص ۴۴۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱۰۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۱۲۔ ایضاً،ص۲۷۲۔

۱۳۔ سلیم اختر،ڈاکٹر، نشانِ جگرِ سوختہ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور۲۰۰۵ء،ص۱۸۔

۱۴۔ ایضاً،ص۲۶۷۔

۱۵۔ سلیم اختر،ڈاکٹر، تاریخ ادب مقاصد، محرکات، مشمولہ:''فنون''۱۹۹۱ء،شمارہ۳۱۔جنوری، فروری، مارچ،ص ص ص۸۲۔۸۵۔۸۶۔

۱۶۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،اردو ادب کی مختصرترین تاریخ،تیسواں ایڈیشن،ص۱۳۰۔

ماحصل

راقم الحروف کے تحقیقی مقالے کا عنوان ''ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں کی روشنی میں'' ہے۔ اس مقالے کے موضوعات کی ترتیب میں اس بات کو خصوصی طور پر مدنظر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مذکورہ ادبی تاریخ کے تفصیلی جائزے کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ نویسی کی روایت کے آغاز وارتقاء، اسالیب، نزاعات، اصول وضوابط، اور ادبی تاریخ نویسی کے قدیم وجدید نظریات ورجحانات کا مکمل طور احاطہ کیا جائے۔ اس مقالے کو چار ابواب، ادبی تاریخ نویسی: اصول و تصورات، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: مصنف وتصنیف، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: تحقیقی جائزہ اور اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: تنقیدی جائزہ، میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کی ذیل میں تاریخ کی تعریف، عام انسانی تاریخ کے آغاز وارتقاء، اردو کی ادبی تاریخ کے آغاز، تذکروں کی روایت، اولین ادبی تواریخ، جدید ادبی تواریخ، تاریخ نویسی کے قدیم وجدید نظریات ومباحث، اصول وضوابط، اور ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' اور اس کے مصنف کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

ادبی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط پر کلی طور پر حتمی رائے قائم کرنا ناممکن ہے کیونکہ ایک تو زمانے کے ساتھ ساتھ علمی معیارات بھی بدلتے جاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ ہر مورخ اور محقق اپنے نقطہ نظر کے تحت ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں پر بحث کرتا ہے، ہاں ایسے اخلاقی معیارات جن کو تمام شعبہ ہائے حیات میں اصولوں کا درجہ حاصل ہے ان کو اردو کی ادبی تاریخ میں بھی حتمی اصولوں کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ مصنف نے اس کتاب کو مختصر ترین صورت میں قلمبند کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے تاریخی وقوعات اور شخصیات کی تشریح و تعبیر کے حوالے سے مختصر مواد پر اکتفا کیا گیا لیکن ڈاکٹر سلیم اختر اس مواد کو کتابی شکل میں منظر عام پر لانے کے بعد مسلسل اس کے موضوعات اور مواد میں تحریف و اضافہ کرتے رہے، یوں ۴۰/۴۵ سال کے طویل سفر میں جہاں یہ کتاب جہاں ایک اہم ادبی تاریخ بن گئی وہاں اس کا حجم بھی ایک بسیط ادبی تاریخ کے برابر ہو گیا جس میں

اردو ادب کی قدیم و جدید تاریخ کے ساتھ ساتھ تنقیدی مباحث کو بھی وسعت ملی، مصنف چونکہ فکری طور پر سگمنڈ فرائیڈ اور یونگ کے نظریات پر مبنی نفسیاتی تنقید کے دبستان سے متاثر ہیں اس لیے انہوں نے یہ کتاب اسی مخصوص تنقیدی نقطہ نظر کے تحت قلمبند کی ، جس کے تحت ادبی وقوعات ،تخلیقات ،شخصیات، اجتماعی معاشرتی روّیوں،جغرافیائی حالات، اور تہذیبوں کے عروج و زوال اور ان عناصر کے ادب پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو ادب کے محققین نے ڈاکٹر سلیم اختر کی اس ادبی تاریخ پر غیر سنجیدہ اسلوب، نظریات کے عدم استحکام، اقربا پروری، اور مخالفین کے حوالے سے جارحانہ اور متعصّبانہ انداز اپنانے کے الزامات لگائے، مصنف نے بعض ادبی شخصیات جیسے ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کے حوالے سے جو جارحانہ اور متعصّبانہ انداز اپنایا ہے وہ ان کی ادبی تاریخ کا ایک نمایاں نقص ہے جو ادبی تاریخ نویسی کے نظریے اور وقار کو بری طرح متاثر کرتا ہے ، اس حوالے سے مصنف کا موقف دوٹوک ہے وہ ذاتی پسند اور مخالفین کے بارے میں متعصّبانہ روّیئے کو مورخ کی نفسیات کا لازمہ قرار دیتے ہیں، یوں انہوں نے اپنی معاصرانہ چشمک کا برملا اظہار کیا ہے۔مصنف کی یہ روش قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے قدیم ادب کے متعلق ہونے والی جدید تحقیقات کو کتاب میں شامل کرنے کے ساتھ ساتھ جدید اردو ادب کا بھی بھرپور احاطہ کیا ہے لیکن اس حوالے سے ایک بڑی خامی اس کتاب میں یہ پائی گئی کہ مصنف نے پاکستان میں نمو پانے والے جدید ادب کا تو ذکر کیا ہے لیکن بھارت کے جدید اردو ادب اور ادیبوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

مصنف تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ لسانیات کا بھی گہرا شعور رکھتے ہیں اور اس موضوع پر ان کی کچھ کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں بھی مصنف نے ''باب۲،۳،۴اور ۵ میں اردو لسانیات اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے حوالے سے تفصیلی بحث شامل کی ہے،اردو زبان کے آغاز کے حوالے سے مصنف نے نہ تو اپنا نظریہ پیش کیا ہے اور نہ ہی کسی نظریے کی تصدیق یا تردید کی ہے، انھوں نے اردو زبان کے آغاز کے بارے میں اب تک پیش کیے جانے والے تمام نظریات کو ادبی اور لسانی تحقیق کا قیمتی سرمایہ قرار دیا ہے۔مصنف کے اسلوب پر محققین ادب نے اعتراضات کیے ہیں لیکن یہ اسلوب ادبی تاریخ نویسی کے روایتی اندازِ تحریر سے ہٹ کر ایک نئے طرز کی تشکیل کرتا ہے جس میں مقفع و مسجع

الفاظ اور بھاری بھرکم اصطلاحات خال خال ہی نظر آتے ہیں یہ نیا طرز مطالعے کے دوران قاری کو یکسانیت اور اکتاہٹ کے احساس سے بچائے رکھتا ہے۔اردو ادب کے تاریخی واقعات کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے مصنف نے کوئی فیصلہ صادر کرنے کے بجائے مختلف محققین کی تحقیقات کا خلاصہ قاری کے سامنے رکھ دیا ہے (ماسوائے انشائیہ کے)یوں پڑھنے والے کے ذہن میں سوالات ابھرتے جاتے ہیں اور کھوج لگانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ کی اس کتاب کو ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں پر پرکھا جائے تو مصنف کے ادبی تاریخ نویسی کے تصور سے اختلافی صورت پیدا ہوتی ہے وہ یوں کہ مصنف نے ادبی تاریخ نویسی کو کسی ایک مخصوص تنقیدی نظریے سے مشروط ہونا لازم قرار دیا ہے۔یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا کسی ایسے علم کو جو تحقیقی نوعیت کا ہو کسی مخصوص دائرہ کار میں محدود کیا جا سکتا ہے؟، جواب ہمیں نہیں میں ملے گا کیونکہ اگر پوری کی پوری تاریخ کو صرف ایک تنقیدی دبستان کے زیر اثر قلمبند کیا جائے تو واقعات اور اشخاص پر اثر انداز ہونے والے دیگر سماجی، سیاسی، مذہبی، جمالی، عمرانی اور دیگر پہلوؤں کا کیونکر احاطہ کیا جا سکے گا۔

پاکستان کے علاقائی ادب کی طرف اس کتاب میں مصنف نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی جس میں اردو زبان وادب کے حوالے سے بھی اچھا خاصا مواد میسر ہوسکتا ہے، پاکستان کے دور افتادہ علاقوں میں پنپنے والے اردو ادب کی طرف محققین کی توجہ ہمیشہ سے کم ہی رہی ہے ان علاقوں کے ایسے ادیب ہی منظر عام پر آتے ہیں جو بڑے شہروں کے ادبی اور علمی حلقوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں، باقی کا ادب اور ادیب اپنے علاقوں تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے جس کی ایک بڑی وجہ محققین ادب کی عدم توجہی ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ اپنی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ قابل قبول ہے، یہ کتاب ایک ہی جلد میں تسلی بخش تاریخی مواد فراہم کرتی ہے، اور اس میں شامل ضمیمہ جات سے مختلف وقتوں کی اہم ادبی تصانیف اور شخصیات کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

کتابیات

۱۔ احسن اختر، ملک، تاریخِ ادبِ اردو، یونی ورسٹی بک ایجنسی، لاہور، ۱۹۷۹ء۔

۲۔ اعجاز حسین ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادبِ اردو، طبعِ دوم، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۶ء۔

۳۔ اعوان، سبینہ اویس، اردو ادب کی معروضی تاریخ، پولیمر پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء۔

۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۹۱ء۔

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۲۰۱۴ء۔

۶۔ ایوب صابر، پروفیسر، اردو کی ابتدا کے بارے میں محققین کے نظریات، طبع دوم، مطبع دارالنوادر، لاہور، ۲۰۱۵ء۔

۷۔ بھٹی، محمد سہیل، تاریخِ ادبِ اردو، بھٹی سنز پبلیشرز، لاہور

۸۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، مجلس ترقی ادب، لاہور، س، ن۔

۹۔ جاوید اقبال ندیم، ذوقِ سلیم، مرتبہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۱۰۔ جلیل اشرف، ڈاکٹر، ڈاکٹر سلیم اختر: بحیثیت نقاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

۱۱۔ جمال الدین، سید، تاریخ نگاری، (قدیم و جدید رجحانات)، مطبع دارالاشعور، لاہور، ۲۰۱۵ء۔

۱۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اردو، جلد اول، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۲۸ء۔

۱۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اردو، جلد چہارم، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۲۰۱۴ء۔

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اردو، جلد دوم، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ء۔

۱۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اردو، جلد سوئم، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

۱۶۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخِ اردو، تاجر کتب آگرہ، ۱۹۴۱ء۔

۱۷۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی، گلشنِ گفتار، مرتبہ، سید محمد ایم۔اے، خورشید پریس، حیدر آباد، ۱۳۳۹ق۔

۱۸۔ دیبی پرشاد، منشی، تذکرہ شعرائے ہنود، بھوپال، ۱۸۸۵ء۔

۱۹۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادبِ اردو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء۔

۲۰۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء۔

۲۱۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخِ ادبِ اردو، مضراب پبلیشرز، ملتان، ۲۰۰۵ء۔

۲۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، سنگ میل پب لی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء۔

۲۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور لاشعور، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۶ء۔

۲۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء۔

۲۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو زبان کیا ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۲۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، اردو رائٹرز گلڈ الہ آباد، ۱۹۸۰ء۔

۲۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، طبع دوم، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

۲۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

۲۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ایران میں اقبال شناسی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء۔

۳۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو سال بہ سال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۳۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تین بڑے نفسیات دان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء۔

۳۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، جوش کا نفسیاتی مطالعہ، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

۳۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نرگس اور کیکٹس، افسانوی مجموعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

۳۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشانِ جگر سوختہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۳۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۶ء۔

۳۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نگاہ اور نقطے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

۳۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۶ء۔

۳۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، پہلا ایڈیشن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۱ء۔

۳۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، تیسواں ایڈیشن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء۔

۴۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، گیارہواں ایڈیشن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء۔

۴۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اقبال اور ہمارے فکری زاویے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۲ء۔

۴۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تخلیق اور لاشعوری محرکات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء۔

۴۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

۴۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نظر اور نظریہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء۔

۴۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مغرب میں نفسیاتی تنقید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۸ء۔

۴۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، شعور اور لاشعور کا شاعر غالب، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۴۷۔ سید سلیمان ندوی، نقوشِ سلیمانی، طبع اول، معارف پریس اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۳۹ء۔

۴۸۔ سید شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۷ء۔

۴۹۔ سید عامر سہیل، ڈاکٹر/نسیم عباس احمر، مرتبہ، ادبی تاریخ نویسی، طبع دوم، پاکستان کوارپریٹیو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۵ء۔

۵۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، شعرائے اردو کے تذکرے، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

۵۱۔ سید فتح علی حسین گردیزی، تذکرہ ریختہ گویاں، مرتبہ، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء۔

۵۲۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت و فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء۔

۵۳۔ شوکت عباس، تواریخِ ادب اردو کا تقابلی مطالعہ، تحقیقی مقالہ، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء۔

۵۴۔ صغیر احمد جان، تنویرِ ادب، نیشنل پریس الہ آباد، ۱۹۳۷ء۔

۵۵۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت اور تخلیقی شخصیت، مرتبہ، گورا پبلیشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء۔

۵۶۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ہمسفر بگولوں کا، الفیصل تاجران، لاہور، ۲۰۱۳ء۔

۵۷۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، (مع شرکا)، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد اول، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔

۵۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقاء، اشاعتِ ثانی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۶۱ء۔

۵۹۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اردو، ایجوکیشنل پبلیشرز لمیٹڈ، ۱۹۶۱ء۔

۶۰۔ علی جواد زیدی، تاریخِ ادب کی تدوین، طبع دوم، نصرت پبلی کیشنز، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء۔

۶۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادبِ اردو، لاہور، ۱۹۷۲ء۔

۶۲۔ قدرت اللہ قاسم، مجموعہ نغز، مرتبہ، حافظ محمود شیرانی، پنجاب یونی ورسٹی پریس، لاہور ۱۹۳۳ء۔

۶۳۔ گیان چند جین، اردو ادب کی تاریخیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۰ء۔

۶۴۔ گیان چند جین، تحقیق کا فن، فکشن ہاوس لاہور، ۲۰۱۴ء۔

۶۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور مؤرخ، فکشن ہاوس، لاہور، س ن۔

۶۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ شناسی، طبع دوم، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۲۰۱۵ء۔

۶۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی آگاہی، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۶ء۔

۶۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کے بدلتے نظریات، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

۶۹۔ محمد حسین آزاد، مولانا، آب حیات، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

۷۰۔ محمد سردار علی، یورپین شعرائے اردو، ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد، دکن، ۱۹۴۴ء۔

۷۱۔ محمد سعید، ڈاکٹر سلیم اختر، (اشاریہ)، مرتبہ، ٹی اینڈ ٹی پبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

۷۲۔ محمد قیام الدین قائم، مخزن نکات، مرتبہ، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۲۹ء۔

۷۳۔ محمود خاں شیرانی، حافظ، پنجاب میں اردو، اشاعتِ ترقی ءاردو، اسلامیہ کالج، لاہور، س ن۔

۷۴۔ محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، دکنی ادب کی تاریخ، اردو اکیڈمی کراچی سندھ، ۱۹۶۹ء۔

۷۵۔ مرزا علی لطف، گلشنِ ہند، مرتبہ، مولوی عبدالحق، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۰۶ء۔

۷۶۔ مولانا عبدالحئی، سید، گلِ رعنا، طبع ثانی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۳۵۳ھ۔

۷۷۔ میر تقی میر، نکات الشعراء، مرتبہ، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء۔

۷۸۔ میر حسن دہلوی، تذکرہ شعرائے اردو، مرتبہ، شیروانی، مولانہ محمد حبیب الرحمن خان، مسلم یونی ورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ، ۱۹۲۲ء۔

۷۹۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، فرائیڈ، نظریہ تحلیل نفسی، پنجاب یونی ورسٹی پریس، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

۸۰۔ وہاب اشرفی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اردو، جلد اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۰۷ء۔

انٹرنیٹ

http://www.wikipedia.org

http://www.internet archive.org

http://www.forum.mohaddis.com

http://www.lib.bazmeurdu.net

http://www.rekhta.org

http://www.urduweb.org

اخبارات ورسائل

۱۔ معیار، مدیر، ڈاکٹر رشید امجد، شعبہ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، شمارہ ۵۔

۲۔ بازیافت، مدیر، ڈاکٹر مبین مرزا، اکادمی بازیافت، کراچی، شمارہ، جولائی ۲۰۰۷ء تا دسمبر ۲۰۰۸ء۔

۳۱۔ سہ ماہی فنون، مدیر، احمد ندیم قاسمی، لاہور، ش م۔ن